حقوقِ اشاعت محفوظ ہیں

نگار

غالب نمبر

سالنامہ ۱۹۶۱ء

ایڈیٹر

نیاز فتحپوری

HaSnain Sialvi

فہرست

غالب کا طرزِ شاعری

(نیاز فتحپوری)

غالب کے بارے میں اس وقت تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جب تک اردو شاعری کا چرچا دنیا میں موجود ہے یہ سلسلہ برابر جاری رہے گا۔ لوگ نئے نئے زاویوں سے غالب کے کلام کا مطالعہ کریں گے، اس کی فنی و معنوی خصوصیات پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالیں گے، اس کے آرٹ کی خوبیوں پر ناقدانہ گفتگو کریں گے اور یہ سب کچھ بڑے شوق سے پڑھا جائے گا ـــــ لیکن ایسا کیوں ہوگا؟۔ اس سوال کا صحیح جواب دنیا دراصل ایک نفسیاتی مطالعہ ہے، جو غالب سے زیادہ زمانہ کے حالات و رجحانات اور خود غالب کی جدت پسند ذہنیت سے تعلق رکھتا ہے۔

جب تک غالب زندہ رہا، لوگ اسے بہت متوحش نگاہوں سے دیکھتے رہے یہاں تک کہ بعض نے اس کے کلام کو مہمل و بے معنی قرار دینے میں بھی تامل نہ کیا۔ لیکن جب زمانہ بدلا، حالات بدلے اور حالات کے ساتھ لوگوں کی ذہنیت بدلی تو غالب اور اس کا کلام دوبارہ پیدا ہوا، اور جس چیز کو پہلے جنس کاسد سمجھ کر رد کر دیا گیا تھا، اب اسی کو "متاع از دست رفتہ" سمجھ کر سینہ سے لگایا جانے لگا، حتیٰ کہ آج اس سے زیادہ محبوب و مقبول شاعر اردو کا کوئی نہیں۔

بات یہ ہے کہ ہر زمانہ میں بعض ہستیاں قبل از وقت پیدا ہو جاتی ہیں جو دراصل مستقبل کی پیش گوئیاں ہوا کرتی ہیں اور جب مستقبل میں سامنے آتے ہیں تو لوگ دفعتاً چونک پڑتے ہیں اور ان میں ایک خاص عظمت و تقدس محسوس کرنے لگتے ہیں۔ غالب بھی اپنے ذوق کے لحاظ سے مستقبل کا شاعر تھا اور وہ اپنے اندر چند در چند مستقبل چھپائے ہوئے

HaSnain Sialvi

تھا اور جب کوئی مستقبل ماضی میں تبدیل ہو جاتا تو پھر وہ دوسرے نئے مستقبل میں جلوہ گر ہو جاتا تھا، یہی سبب ہے کہ پچھلی ایک صدی میں شاعری اور خصوصیت کے ساتھ غزل گوئی میں جب جب ذہنی انقلاب پیدا ہوا غالب بھی ابھرتا رہا، یہاں تک کہ موجودہ دور ترقی پسندی میں بعض نقاد اسی کو سب سے پہلا ترقی پسند شاعر کہتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ غالب کی شاعری ماضی کی داستان نہ تھی بلکہ مستقبل کا نفسیاتی رجحان بھی جو اوّل اوّل نامانوس سی چیز معلوم ہوتی تھی، لیکن بعد کو وہی زمانہ کی انتہائی تمنا قرار پائی۔ غالب چونکہ فطرتاً بڑا زود آگاہ (SELF CONSCIOUS) شاعر تھا اس لیے وہ خود بھی ان پوشیدہ حقیقتوں اور اپنے اندر چھپے ہوئے امکانات سے واقف تھا اور اسی لیے وہ ایک بار اپنے عہد کی بے حسی کو دیکھ کر بے اختیار یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ:-

شہرتِ شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

غالب کے عہد تک اردو غزل برابر ایک ہی روش پر چلی آ رہی تھی۔ وہی بندھے ٹکے محاورے، وہی سیدھا سادھا روزمرہ، وہی مقررہ تشبیہات و استعارات اور وہی ہجر و وصال کے پامال جذبات حسن و عشق۔ گویا غزل نام تھا صرف سنی سنائی باتوں کا ایک ہی لب و لہجہ میں دہراتے رہنے کا اور لوگ عام طور پر اس سے داستان ہی کا سا لطف اٹھاتے تھے، لیکن غالب چونکہ فطرتاً بہت شوخ، بے چین، ندرت پسند واقع ہوا تھا، اس لئے یہ داستاں سرائی اسے پسند نہ آئی اور وہ محافلِ شعر و سخن میں بالکل ایک نئے آہنگ کے ساتھ داخل ہوا جس کا مقصود ممکن ہے دوسروں کو چونکانا بھی ہو، لیکن اس کا مدعا زیادہ تر خود اپنے ذوق کی تسکین تھی۔

غالب کا یہ آہنگ یقیناً اس کی فطرت کا تقاضہ تھا، لیکن وہ پورا ہوا، اس کی ابتدائی فارسی تعلیم اور کلام بیدل کے مطالعہ سے، اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ غالب کے طرزِ شاعری

کی ابتداء رنگِ بہار ایجادی بیدل سے ہوئی۔ لیکن چونکہ بیدل زبان نہیں بلکہ تخیل کا شاعر تھا، وہ زبان کا پابند نہ تھا بلکہ اس کی زبان خود تخیل سے پیدا ہوتی تھی جو حد درجہ بلند و دقیق تھی، اس لیے اردو اُس کی متحمل نہ ہو سکی اور آخر کار غالب کو یہ بیدلانہ رنگ جس سے اس کی اردو شاعری کی ابتدا ہوئی تھی ترک کرنا پڑا۔

ظاہر ہے کہ یہ رنگ ترک کرنے کے بعد وہ میر، سودا اور میر حسن کے رنگ کی طرف نہ لوٹ سکتا تھا، کیونکہ یہ اس کے ذوق اور اس کی فطری اپج کے خلاف تھا اس لیے اس نے خود اپنے فارسی ذوق اور دوسرے ایرانی شعراء کے کلام کو سامنے رکھ کر صرف ان فارسی تراکیب کا استعمال شروع کیا جن کی اردو متحمل ہو سکتی تھی اور اس طرح معنی آفرینی اور ندرتِ بیان، جدتِ اظہار، طرفگیٔ اسلوب سے اُردو غزل کو مالا مال کر دیا اور غزل گوئی کا بالکل نیا طرز پیدا کیا۔

اردو میں صاحب طرز شعراء اور بھی ہوئے ہیں، جن میں میر، نظیر، ناسخ اور مومن خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں، لیکن فن اور جذبات کے لحاظ سے ان سب کا ایک رنگ تھا اور اسی رنگ سے وہ الگ الگ پہچانے جا سکتے تھے، لیکن غالب کی فضائے شعر بڑی وسیع و متنوع تھی۔ میر کی فضا یکسر یاس و حسرت کی سوگوارانہ فضا تھی جس میں میر کے سرہانے بیٹھ کر زور سے باتیں کرنا بھی آداب کے خلاف تھا لیکن غالب نے حسرت و یاس کے بیان میں بھی امیدوں کے خوددارانہ مطالبہ کو ہاتھ سے جانے نہ دیا اور انتہائی غم کی حالت میں بھی وہ طلب نشاط کی فکر سے غافل نہیں رہا۔ میر کی شاعری موت کی آسودگی تھی اور غالب کی شاعری زندگی کی تڑپ۔

نظیر ایک قلندرانہ انداز کے عوامی شاعر تھے اور اس میں شک نہیں کہ اس خصوص میں ان کا کوئی ہمسر نظر نہیں آتا، غالب اس کے بالکل برعکس خواص کے شاعر تھے، ایک ایسے ارسٹوکریٹک (ARISTOCRATIC) شاعر جو اپنی خودداری، اپنے رکھ رکھاؤ اور

اپنی عاشقانہ اہمیت کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ ناسخ کی شاعری کا حسن بجز غازہ و مشاطگی کی شاعری تھی جس سے غالب کو دور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔ مومن کی شاعری، گوشت و پوست کی جنسی شاعری تھی جس میں فلسفیانہ فکر اور متصوفانہ ذاتیت کی کوئی گنجائش نہ تھی، لیکن غالب کے حسن و عشق میں ماورائے حسن و عشق بھی شامل تھا اور اس کی شاعری در اصل نہایت وسیع کائناتی شاعری تھی جو دل و دماغ دونوں کے انتہائی مفکرانہ احساس سے تعلق رکھتی تھی وہ روایتی نہیں بلکہ درایتی شاعر تھا، وہ مقلد نہیں مجتہد تھا اور ایک ایسے نئے طرز شاعری کا خلاق تھا جس سے دنیا بالکل ناواقف تھی۔

چوں کہ ماضی کی روایات سے ہٹ کر کوئی نئی بات ایسی کہنا جو ذہن انسانی کو دفعتاً چونکا دے آسان نہیں، اس لیے غالب نے اس مقصد حصول کے لیے نئی زبان پیدا کی، نیا لب و لہجہ اختراع کیا، نیا انداز بیان ایجاد کیا اور جو کچھ کہا اس قدر اعتماد کے ساتھ کہا، ایسی بلند آہنگی سے کہا گویا وہ ایک کڑکا تھا، ایک تیز روشن شہاب ثاقب تھا جس کے سننے اور دیکھنے پر دنیا مجبور ہو گئی۔

غالب کو روش عام بالکل پسند نہ تھی، وہ اپنی راہ سب سے الگ بنانا پسند کرتا تھا، لکیر کا فقیر بننا اس کی فطرت کے منافی تھا، کہی ہوئی بات کہنے سے اسے سخت نفرت تھی، وہ ہمیشہ کوئی نئی بات نئے اسلوب سے کہنا چاہتا تھا، اس لیے وہ نئے نئے زاویے بیان کے تلاش کرتا تھا، فارسی کی نئی نئی ترکیبوں سے کام لیتا تھا جن کے استعمال کا ذوق اسے بیدل کے کلام کے مطالعہ سے پیدا ہوا تھا، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ۔۔۔ یک بیاباں ماندگی۔۔۔ جنوں جولاں گدا۔۔۔ عرض گرانجانی۔۔۔ پرفشانی شمع۔۔۔ وغیرہ کی متعدد ترکیبیں بالکل بیدل کی ترکیبیں ہیں۔ پھر اگر غالب کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو وہ اس خارزار سے شاید کبھی نہ نکلتا، لیکن چونکہ وہ بڑے صحیح ذوق اور طبع سلیم کا مالک تھا اس لیے خود اس نے اردو میں اس رنگ کی ناہمواری کو محسوس کیا اور فارسی کی صرف ان ترکیبوں سے کام لینا شروع کیا جنھیں اردو

کا مزاج قبول کر سکتا تھا اور یہ تھا غالب کی شاعری کا دوسرا دور، پہلا دور اختراع محض اور جوشِ ندرت پسندی کا دور تھا جس میں صرف فارسی ترکیبوں کا استعمال ہی پیشِ نظر رہتا تھا اور مفہوم و معنی کی معقولیت نظر انداز کردی جاتی تھی مثلاً :-

رکھا غفلت نے دور افتادۂ ذوقِ فنا ورنہ
اشاراتِ فہم کو ہر ناخنِ بریدہ ابرو تھا

لیکن دوسرا دور بہت سنبھلا ہوا دور تھا جس میں فارسی تراکیب کے ساتھ تغزل کی چاشنی بھی پائی جاتی تھی اور باوجود اشکال پسندی و دقت آفرینی کے داخلی کیفیت بھی اس میں محسوس ہوتی تھی مثلاً :-

جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی نمک پاشِ خراشِ دل ہے لذت زندگانی کی
کشاکشہائے ہستی سے کرے کیا سعیٔ آزادی ہوئی زنجیر، موجِ آب کو فرصت روانی کی

اسکے بعد غالب کی شاعری کا تیسرا دور شروع ہوا، جب فارسی کی لطیف ترکیبوں کے ساتھ، زبان کی شیرینی و حلاوت اور متفکرانہ معنی آفرینی کے ساتھ، انداز بیان کی سلاست و روانی بھی شامل ہو گئی مثلاً :-

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

یا

درماندگی میں غالبؔ کچھ بن پڑے تو جانوں جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا

اور اس دور کا ارتقاء آخر کار اس حد تک پہونچ گیا کہ غالب کی شاعری یکسر سحر حلال ہو کر رہ گئی اور اس قسم کے سہل ممتنع اشعار اُن کے قلم سے نکلنے لگے۔

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے بے نیازی تری عادت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

غالب کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ پامال مضامین کو کبھی ہاتھ نہیں

لگاتے، اساسیانہ تشبیہات و استعارات سے ہمیشہ اجتناب کرتے ہیں اور اگر کوئی مضمون پرانا ہو تو اس کو بھی اپنے انداز بیان کی ندرت سے نیا بنا دیتے ہیں۔ مثلاً ذوق، جنت کے تصور پر نہایت عامیانہ انداز میں اس طرح تنقید کرتا ہے کہ:

کب حق پرست زاہد جنت پرست ہے　　حوروں پہ مر رہا ہے یہ شہوت پرست ہے

لیکن غالب کی ندرت کو ملاحظہ فرمایئے۔ کہتے ہیں۔

طاعت میں تا رہے نہ مے انگبیں کی لاگ　　دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

مومن کا مشہور شعر ہے:۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

یقیناً مومن کا یہ شعر اتنا بلند و پاکیزہ ہے کہ اس میں ترقی کی گنجائش بظاہر نظر نہیں آتی لیکن غالب اس سے زیادہ بلند سطح پر پہونچ کر یوں کہتے ہیں۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال　　ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

موجودات اور مظاہر و آثار کو دیکھ کر اعتبار و بصیرت حاصل کرنا مشہور فلسفہ تصوف ہے جسے درد نے یوں ظاہر کیا ہے۔

آہستہ سے چل میاں کہار　　ہر سنگ دوکان شیشہ گر ہے

غالب کی ندرت بیان و ژرف نگاہی ملاحظہ ہو۔ کہتا ہے۔

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ　　طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

تجلی و طور کے سلسلہ میں موسیٰ پر طعن کرنا شاعروں کا بڑا دیرینہ شیوہ ہے لیکن غالب اسی پامال خیال کو اس طرح ظاہر کرتا ہے۔

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر　　دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

استعارات و تشبیہات کا استعمال غالب سے پہلے بھی رائج تھا لیکن اس میں کوئی ندرت نہ تھی، غالب پہلا شخص تھا جس نے فارسی استعارات استعمال کئے اور اس خوبی

HaSnain Sialvi

کے ساتھ کہ اردو غزل میں جان پڑ گئی مثلاً:۔

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا   بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز   پھر ترا وقت سفر یاد آیا

غالب کی دوسری خصوصیت جو بہت کم کسی دوسرے شاعر میں پائی جاتی ہے، اس کی شوخی و ظرافت ہے جو اس کی زندگی کی ہر ہر موڑ پر نظر آتی ہے۔ یہاں تک کہ حالی نے انہیں "حیوان ظریف" بھی کہہ دیا۔ اس کے فارسی کلام میں اس کی عجیب و غریب مثالیں ملتی ہیں لیکن اردو میں بھی ایسی دلچسپ مثالوں کی کمی نہیں ــــ اس کی شوخی و ظرافت، بھی عامیانہ نہیں، بلکہ خاصہ کی چیز ہے جو صرف انداز بیان سے پیدا کی جاتی ہے۔ مثلاً:۔

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے   بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

یا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی   بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

غالب کی تیسری خصوصیت اس کی خودداری و خود بینی ہے۔ وہ محبت میں تذلل کا قائل نہیں، وہ رونے بسورنے اور ہائے ہائے کو پسند نہیں کرتا۔ اگر وہ محبت کرتا ہے تو چاہتا ہے کہ اس کی محبت کا احترام بھی کیا جائے، یہاں تک کہ وہ محبوب کے گھر جانے کا تصور بھی کرتا ہے تو اس شان سے کہ:۔

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے   یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

پھر اس میں خصوصیت دربار ہی کی نہ تھی بلکہ بندگی و خدائی کے تعلق میں اس کی یہ خودداری در کعبہ تک پہونچ جاتی تھی:۔

الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

غالب اس کو اپنی توہین سمجھتا تھا کہ وہ چیز جاہے اور اسے نہ ملے اور اسی

غم و غصہ میں وہ اس حد تک پہونچ جاتا تھا کہ :-

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

غالب اپنے جذبات کے لحاظ سے بڑا شدت پسند شخص تھا اور اس کے تاثرات کی شدت کی کوئی حد و پایاں نہ تھی۔ مثلاً محبت میں جذبۂ رشک کو لیجئے کہ وہ یقیناً فطری چیز ہے، لیکن غالب کے یہاں یہ جذبہ اس سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے اور انسان تو انسان وہ خدا سے بھی بدظن ہو سکتا ہے:-

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

مگر یہ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی وہ خود اپنے آپ پر بھی رشک کرنے لگتا ہے:-

میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

اور جب کوچۂ محبوب میں اس کی گھر کی تلاش میں جاتے ہیں تو محبوب کا نام تک نہیں لیتے اور صرف یہ پوچھتے ہیں کہ "جاؤں کدھر کو میں"۔

غالب کی یہ انتہا پسندی اور نزاکتِ خیال خالص عاشقانہ رنگ میں تو زیادہ نمایاں نہیں کیونکہ اس کا میدان زیادہ وسیع نہیں لیکن جب وہ مسائل تصوف بیان کرنے پر آجاتے ہیں تو پھر ان کی بلندی کی کوئی انتہا نہیں رہتی، اس کا کلام فلسفۂ حیات اور مسائل حکمت و تصوف سے بھرا پڑا ہے اور اس سلسلہ میں اس نے اتنی لطیف، اتنی بلند، اس قدر انچھوتی باتیں کہی ہیں کہ اردو میں غالب کے سوا ہمیں کہیں اور نہیں ملتیں۔

آپ تمام شاعروں کے دواوین چھان ڈالیے لیکن غالب کے اس شعر کا جواب شاید ہی آپ کو کہیں مل سکے۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

اس کا خاص سبب یہ ہے کہ اس کی ترکتازانہ شاعری کے لیے بڑی وسیع میدان کی ضرورت تھی اور یہ اسے صرف تصوف ہی میں مل سکتا تھا لیکن وہ تصوف نہیں جس کا تعلق محض خشک اصطلاحات یا بے نمک دعاوی تصوف سے ہے۔

HaSnain Sialvi

غالبؔ کی شاعرانہ خصوصیات

(نیاز فتحپوری)

احساسِ خودی کمال کے ساتھ احساس خودی ضروری ہے، لیکن بعض کا یہ انا ظاہر نہیں ہوتا اور بعض کا زبان تک آجاتا ہے فارسی شعراء میں عرفیؔ اور غالبؔ دونوں میں یہ نیت پائی جاتی تھی اور اتنی شدید کہ دونوں نے کھلم کھلا اس کا اظہار کیا، اور بار بار کیا۔

عرفیؔ نے تو حد کر دی ـــــ لکھتا ہے:۔

من کیستم آں سالکِ کونین مسیرم ۔۔۔ کز بیختہ جوہرِ قدس ست خمیرم

یعنی میں وہ ہوں جس کا خمیر "جوہر قدس" یعنی لطافت و پاکیزگی سے ہوا ہے اور جوہر قدس وہ جو پہلے اچھی طرح چھان لیا گیا تھا۔ اسے نزاکتِ خیال کہیے یا مبالغہ یہ ہے اتنا بڑا انا کہ اس سے زیادہ اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو وہی جو منصورؔ نے کہا اور سولی پر چڑھ گیا۔

غالبؔ کے یہاں بھی ہم کو بالکل یہی چیز ملتی ہے، لیکن زیادہ لطیف شاعرانہ احساس کے ساتھ۔ جب وہ قمار بازی کی پاداش میں زنداں بھیجے گئے تو اس نعرہ کے ساتھ قید خانہ میں داخل ہوئے:۔

پاسباناں بہم آئید کہ من می آیم ۔۔۔ درِ زنداں بکشائید کہ من می آیم

اے عزیزاں کہ دریں کلبہ اقامت دارید ۔۔۔ بخت خود را بستائید کہ من می آیم

اور یہ من کون تھا، اس کی صراحت بھی سن لیجئے کہ:۔

آنچہ فرداست ہم امروز در آمد گوئی ۔۔۔ آفتاب از جہت قبلہ بر آمد گوئی

یعنی لوگوں نے سنا ہوگا کہ کسی وقت آفتاب سمت قبلہ (یعنی مغرب) سے طلوع کرے گا اور توبہ کا دروازہ بند ہوجائے گا۔ سو یہ بات جو کل ہونے والی تھی آج پوری ہوجاتی ہے، کیونکہ میرا زنداں میں آنا ایسا ہی ہے جیسے سمت قبلہ سے آفتاب کا طلوع ہوجانا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب اظہار خودی میں کتنی لطیف شعریت سے کام لیتے تھے۔

ایک جگہ وہ خسرو و سعدی پر اپنا تفوق ظاہر کرتے ہیں لیکن اس پاکیزہ استدلال کے ساتھ:۔

باخذ فیض زمبدا فرو بزم از اسلاف — کہ بودہ ام قدرے دیر تر دراں درگاہ
ظہور من بہ جہاں در ہزار و بست و دو بیت — ظہور خسرو و سعدی بہ شش صد و پنجاہ

یعنی خسرو و سعدی کے مقابلہ میں مبدا فیاض سے کسب فیض کا مجھے زیادہ موقع ملا ہے کیونکہ وہ سنہ ۶۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور میں ۱۲۲۲ھ میں یعنی بہ نسبت خسرو و سعدی کے مجھے مبداء فیاض سے کسب فیض کی فرصت زیادہ نصیب ہوئی ہے۔

غالب کو اپنے شاعرانہ کمال کا احساس اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ اس سے کسی اور کا استفادہ کرنا بھی ممکن نہ تھا:۔

ما ہمائے گرم پروازیم فیض از ما مجوے — سایہ ہمچوں دود بالا می رود از بال ما

یعنی میری گرمی پرواز کا یہ عالم ہے کہ میرے پر و بال کا سایہ بھی دھوئیں کی طرح بالا ہی بالا چلا جاتا ہے اور میرے سایہ تک بھی کوئی نہیں پہونچ سکتا۔

اسی خیال کو اس نے ایک دوسرے زاویہ سے اردو میں یوں ظاہر کیا ہے:۔

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی — روح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں

غالب کو اپنی شاعرانہ عظمت کا احساس ایک خاص نوعیت لیے ہوئے تھا۔ یعنی

وہ سمجھتا تھا کہ شعراء خود کوشش کر کے فنِ شعر تک پہونچے اور یہاں خود فنِ شعر اُس تک پہونچا۔

شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالبؔ

ظاہر ہے کہ جو شاعر اتنے زبردست ادعائے خودی کے ساتھ سامنے آئے گا تو اس سے حسد کرنے والے بھی پیدا ہو جائیں گے، لیکن غالبؔ ان کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے ملاحظہ فرمائیے:۔

از بہر خویش جنّتِ دربستہ ایم ما بر روئے حاسداں در دوزخ کشادہ رشک

یعنی ہم تو اپنی شاعری کے لحاظ سے ایک "جنّتِ دربستہ" ہیں کہ وہاں تک کوئی نہیں پہونچ سکتا، لیکن اس چیز نے حاسدوں کے لیے دوزخ کا دروازہ ضرور کھولدیا ہے جس میں وہ ہر وقت جلتے رہتے ہیں۔

ایک مسلسل غزل میں قدرت کے بعض عطایا کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

سوخت آتشکدہ ز آتش نفسم دادند ریخت بتخانہ ز ناقوس فغانم دادند

گہر از رایتِ شاہانِ عجم برچیدند بعوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند

گوہر از تاج گسستند و بدانش بستند ہر چہ بردند بہ پیدا، بہ نہانم دادند

ہر چہ از دستگہ پارس بہ یغما بردند تا بنالم ہم ازاں جملہ زبانم دادند

یعنی عرب نے جو دولت عجم سے چھینی تھی وہ سب کی سب قدرت نے مجھے قلم و زبان کی صورت میں دیدی، اسی مضمون کو وہ صرف ایک شعر میں سمیٹ کر یوں کہتے ہیں:۔

دانش و گنجینہ پندار ی یکے ست حق نہاں داد آنچہ پیدا خواستم

یعنی خزینۂ زر اور علم و عقل دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ ان میں فرق نہیں آسکتے وہ اگر مجھے نہ ملا تو کوئی مضائقہ نہیں، دوسری چیز تو مجھے مل گئی لیکن اسکے باوجود اگر دنیا نے اس کی قدر نہ کی تو اس کا سبب یہ تھا کہ:۔

نقدِ خرد دم سکّۂ سلطاں نپذیرم جنبیں ہنرم، گرمی بازار ندارم

اور اگر میں مشہور نہ ہوا تو صرف اس لیے کہ :-

زخمِ جگرم بخیۂ مرہم نہ پسندم موجِ گہرم جنبش رفتار ندارم

بہادر شاہ کے ایک مدحیہ قصیدہ میں وہ ایک جگہ اہلِ مذہب کے مسلک و شعار کا ذکر کرتے ہوئے اپنے کلام کی بلندی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ جب یہ تمام اہلِ نظر میرا کلام دیکھیں گے تو میری نظم کو آبِ حیات اور نثر کو نسخۂ اعجاز قرار دیں گے، اس کو بار بار نقل کریں گے اور اس سے تفاؤل کیا کریں گے :-

نظم را موجۂ سرچشمۂ حیواں فہمند نثر را نسخۂ اعجاز مسیحا بینند
گہ پئے نقل بصد گونہ تقاضہ خواہند گہ پئے فال بصد رنگ تمنا بینند

اسی طرح اپنے ایک منظوم خط میں نواب یوسف علی خاں والی رامپور سے یوں خطاب کرتے ہیں :-

غالب بہ سخن نام من آمد ازل آورد دانی کہ دریں شیوۂ منم عامی و جاہل
در فن سخنے دم مزن از عرفی و طالب ایں آیۂ خاص ست کہ بر من شدہ نازل
آں را کہ صریر قلم ہوش رباید دیگر نبرد ذوق ز آواز عنادل

جناب امیر کی منقبت میں غالب نے ایک بڑے معرکہ کا ترکیب بند لکھا تھا اس میں بھی غالب نے اپنا تعارف بڑے لطیف شاعرانہ انداز سے اس طرح کیا ہے کہ میں زمانہ کے تمام رازہائے سربستہ کا محرم ہوں اور مجھے دنیا میں محض اس لیے ذلیل و خوار رکھا گیا ہے کہ یہ پوشیدہ راز ظاہر نہ ہونے پائیں۔

محرم رازِ نہانِ روزگارم کردہ اند تا بجرم گوش بنہد خلق، خوارم کردہ اند

تیسرے بند میں اس سے زیادہ زور کے ساتھ اپنی دولت علم و فضل کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

درویشی شہرۂ دہر از تہی دستی ست مرغ   رفتہ مسکین رانہ یاد ز گنج پنہاں نیز ہم

انسان کو بخل درویشی کا طعنہ دینا بیکار ہے کیونکہ اس کا سارا خزانہ تو میرے اندر پنہاں ہے، وہ مجھے کیا دے گا اور میں کیا لوں گا۔

ایک بار کسی نے ان کے ایک شعر پر یہ اعتراض کیا کہ کسی قدیم شاعر کے کلام سے ماخوذ ہے یا اس سے توارد ہوا ہے۔ غالب نے اس پر ایک بڑا عجیب قطعہ لکھا جس میں اپنے مرتبہ شاعری کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ جس مضمون کو توارد کہا جاتا ہے وہ دراصل میرا ہی مضمون تھا، یعنی مجھ سے پہلے اگر کسی نے کوئی اچھی بات کہی ہے تو دراصل وہ میری ہی ملکیت تھی جو نہاں خانۂ ازل میں محفوظ تھی اور چرالی گئی۔

ہزار معنی سرجوش خاص نطق من ست   کہ اہل ذوق دل وگوش از عمل من بردست

ز رفتگاں بہ یکے گر توارد م رو داد   مراں کہ خوبی آرائش غزل بردست

مراست ننگ و لے فخر اوست کاں بہ سخن   بہ سعی فکر رسا جا بداں محل بردست

مبر گمان توارد یقیں شناس کہ دزد   متاع من ز نہاں خانۂ ازل بردست

غالب، عرفی و زلالی کا بڑا قائل تھا، لیکن ایک جگہ شعراء پیشیں کے ذکر کے سلسلہ میں یہ لکھتے ہوئے کہ "پیشینیاں چہ احسان بودہ اند و فن آنتابستم" اپنی برتری کو اس طرح ظاہر کرتا ہے:-

مسیح شوکت عرفی کہ بود شیرازی   مشو اسیر زلالی کہ بود خوانساری

بہ سومنات خیالم در آئے تا بینی   رواں فروز بر دوش ہائے زناری

ایک قطعہ میں اس نے اپنے نسب کی بلندی و برتری کا اظہار کرتے ہوئے، اپنے فضل و کمال کا ذکر اس طرح کیا ہے:-

او رز معنی سخن گزار دہ   خود چہ گویم تا چہ و چندیم

فیض حق را ہمینہ شاگردیم   عقل کل را ہمینہ فرزندیم

ایک اور قطعہ میں اپنی فارسی شاعری پر یوں تبصرہ کرتا ہے۔

فارسی بیں تا ببرانی کاندر اقلیم خیال مانی و ارژنگم و آں نسخہ ارتنگ من ست

ایک مدحیہ قطعہ میں اپنا تعارف اس طرح کیا ہے۔

چوں تازہ کنم در سخن آئین بیاں را آوازہ دہم شیوہ ربا ہمنفساں را

رقصد قلم بخود و من خود زرہ مہر بر زہرہ نشانم اثر جنبش آں را

مسائل تصوف

تصوف و حقائق تصوف کے سلسلہ میں بھی غالب کو اپنے درکرد رعیت پر بڑا ناز تھا چنانچہ ایک جگہ انھوں نے برملا کہہ دیا کہ:۔

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

حالانکہ یہ بات ذرا گری ہوئی ہے کہ بادہ خوار ہونے کی وجہ سے وہ اپنی ولایت کو مشکوک سمجھتے ہیں۔ دراصل کہنا یہ چاہیے تھا کہ:۔

تو کبھی ولی نہ ہوتا جو نہ بادہ خوار ہوتا

کیونکہ مسائل تصوف کے سلسلہ میں غالب کے وہی اشعار زیادہ بلند ہیں جو "موج صہبا" ہی کے وقت کہے جاسکتے تھے۔

غالب کا ایک مشہور شعر ہے:

ہے مشتمل وجود وصور پر نمود بحر یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

جو یقیناً اس وقت ہوا ہوگا جب کئی دن تک انھیں شراب نہ ملی ہوگی ۔ برخلاف اس کے یہ شعر دیکھیے:۔

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یارب ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

کہ یہ خیال اس وقت تک غالب کے ذہن میں آہی نہ سکتا تھا جب تک وہ مست و سرشار نہ ہوتا۔

تصوف یکسر عجم کی پیداوار ہے، عرب و اہل عرب کو اس سے کوئی لگاؤ نہ تھا، اسی

لیے عربی شاعری میں تصوف کا وجود نہیں اور عجمی شاعری کا طرۂ امتیاز ہی بیانِ تصوف ہے، چنانچہ غالب کے یہاں بھی تصوف کا زیادہ عنصر اس کے فارسی کلام ہی میں پایا جاتا ہے اور اردو میں اس کے مسائلِ تصوف زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ لیکن بعض حضرات نے اردو فارسی دونوں میں زیادہ تر اس کے بیانِ تصوف ہی کو بہت سراہا ہے اور اس سلسلہ میں بربنائے حسنِ ظن ان اشعار کو بھی لے لیا ہے جو تصوف سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ مثلاً۔

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے	بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے
جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیمروز	آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں
سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست	لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو
کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ	کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے
جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی	مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی
سوز ترا رواں (روح) ہمہ در خویشتن گرفت	از داغ تہمتے بہ جگر بستہ ایم ما
فرصت از کف مدہ و وقت غنیمت پندار	نیست گر صبح بہارے شب ماہے دریاب
بیخود بزیرِ سایۂ طوبیٰ غنودہ اند	شبگیر رہروانِ تمنا بلند نیست
ہمچو رازے کہ بہ مستی ز دل آید بیروں	از بہاراں ہمہ بوئیت ز صبا می آید
گم شد نشانِ من چو رسیدم بہ کنجِ دیر	مانند آں صدا کہ بگوشِ گراں رسید
یک گریہ لب از ضبط و صد گریہ رضا دہ	تا تلخی آں زہر تواند بہ گلو برد
ہر شمیمے را مشامے در خور است	بوئے پیراہن بہ کنعاں می رود
بحث و جدل بجائے ماں میکدہ جوئے کاندراں	کس نفس از جمل نزد کس سخن از فدک نخواست
زمام ناقہ بدستِ تصرفِ شوق است	بسوئے قیس گرایش ز ساربان نبود
"تیغت ز فرق تا بہ گلویم رسیدہ باد"	شوخی ز حد گذشت زبانم بریدہ باد

ذوقے[1] ست ہمدمی بفغاں، بگذرم ز رشک / خارِ رہت بہ پائے عزیزاں خلیدہ باد

رسید دانہ و بالید و آشیانگہ شد / در انتظارِ ہما، دام چیدہ ایم بنگر

متذکرۂ بالا اشعار کو جو خالص عاشقانہ رنگ کے ہیں، حقیقت و معرفت کی طرف لے جانا بڑی نا روا جسارت ہے۔

غالب کے یہاں تصوف کے اشعار یقیناً پائے جاتے ہیں لیکن سب کے سب معیاری نہیں ہیں بعض وہ اشعار جن میں متصوفین کے نظریوں کو صرف صاف صاف کھلے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ان میں تصوف تو یقیناً ہے، لیکن "غالبیت" ان میں بالکل نہیں یا بہت کم پائی جاتی ہے۔ مثلاً:-

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود / ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا / یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا / درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا / جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر / یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن / ہم کو تقلید تنک ظرفیِ منصور نہیں

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے / تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

ہے وہی بدمستیِ ہر ذرہ کا خود عذرخواہ / جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی / ہر چند کہیں کہ "ہے" نہیں ہے

---

[1] میرے ذوقِ ہمدمی کا تقاضہ ہے کہ آہ و فغاں میں کچھ اور لوگ بھی میرے شریک ہو جائیں اس لیے جذبۂ رشک سے گزر کر میں اب یہی چاہتا ہوں کہ خدا کرے تیرے رہگذر کے کانٹے دوسروں کے پاؤں میں چبھ جائیں اور وہ بھی میرے ساتھ آہ و فغاں میں مبتلا ہوں۔

تو می فتادہ چو نسبت ادب مجو غالب
ندیدہ ای کہ سوئے قبلہ پشت محراب ست

ز دہم بہ نقش خیالے کشیدہ ای ورنہ
وجود خلق چو عنقا بہ دہر نایاب ست

نشاط معنویان از شرابخانۂ تست
فسون بابلیان فصلے از فسانۂ تست

آخر منزل نخست خویش تو راہ می زنم
اول منزل و گرنہ تو زاد میدہد

کفر و دیں چیست جز آلایش پندار وجود
پاک شو پاک کہ ہم کفر تو دین تو شود

کو فنا تا ہمہ آلایش پندار برد
از صور جلوہ و از آئینہ زنگار برد

ان اشعار میں جو مسائل تصوف بیان کیے گئے ہیں، وہ بہ لحاظ بیان اپنے اندر کوئی ندرت نہیں رکھتے، لیکن جب غالب اس سطح سے بلند ہو کر، لطیف تعبیرات کے ذریعے سے حقائق تصوف کو پیش کرتا ہے تو غالب کی انفرادیت پوری طرح سامنے آجاتی ہے۔ مثلاً چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

خطے بہ ہستی عالم کشیدہ ایم از مژہ بستن
ز خود رفتیم و ہم با خویشتن بردیم دنیا را

رواج صومعہ ہستی ست زینہار مرو
متاع میکدہ مستی ست ہوشیار بیا

آں راز کہ در سینہ نہان ست نہ وعظ ست
بردار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت

قفس و دام را گناہے نیست
ریختن در نہاد بال و پرست

ریزد آں برگ و ایں گل افشاند
ہم خزاں ہم بہار در گزرست

اے کہ بدیدہ غم زیست دگر مبین غم زیست
نازش غم نہ ہم زیست خاطر شاد می رود

خردہ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

رخ کشودند و لب ہرزہ سرایم بستند — دل ربودند و دو چشم نگرانم دادند

ہر کجا دشنۂ شوق تو جراحت بارد — جز خراشے بہ جگر گوشۂ ادہم نرسد

طوبیٔ فیض تو ہر جا گل و بار افشاند — جز نسیمے بہ پرستشگہ مریم نرسد

بہ خروش آدمیزاد حق می جو، ز مجنوں کم نئی بارے — دلش با محمل است اما زباں با سارباں دارد

چرا بہ سنگ دگیا بیچی اے زبانۂ طور — ز راہ دیدہ بدل در رو، و ز جان برخیز

بعض اشعار تصوف غالب نے بیدل کے رنگ میں بھی لکھے ہیں۔ مثلاً

دود سودائے تتق بست آسماں نامیدمش — دیدہ بر خواب پریشاں زد جہاں نامیدمش

وہم خاکے ریخت در چشم بیاباں دیدمش — قطرۂ بگداخت بحر بیکراں نامیدمش

باد دامن زد بر آتش نوبہاراں خواندمش — داغ گشت آں شعلہ از ستی خزاں نامیدمش

دید در آنکہ تا نہد دل بہ شمار دلبری — در دل سنگ بنگر در قص بتان آذری

اے کہ تو ہیچ ذرہ را جز بہ رہ تو روئے نیست — در طلبت تواں گرفت بادیہ را بہ رہبری

حیف کہ من بہ خوں تپم در تو سخن رود کہ تو — اشک بدیدہ نشمری، نالہ بہ سینہ بنگری

متذکرۂ بالا اشعار غزل یقیناً مسائل تصوف سے تعلق رکھتے ہیں اور غالب نے ان کے اظہار میں بڑی شاعرانہ لطافت و پاکیزگی سے کام لیا ہے۔

غالب کا منظوم کلام جو کلیات غالب کے نام سے شائع ہوا ہے، اس کا حجم ۵۱۴ صفحات کو محیط ہے اور ۶۶ قطعات، ایک مخمس، دو ترکیب بند، ایک ترجیع بند، گیارہ مثنویوں، ۶۴ قصاید، ۱۰۴ رباعیوں اور ۳۴۰ غزلوں پر مشتمل ہے۔

قصیدوں اور غزلوں کے اشعار تین تین ہزار سے کچھ اوپر ہیں اور مثنوی کے ابیات دو ہزار کے قریب ہیں۔ اس طرح لیہ اکلیات قریب قریب دس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اور ان میں سے فلسفہ و تصوف کے اشعار دو تین سو سے زیادہ نہ ہوں گے اس لیے

یقیناً یہ بڑی زیادتی ہے کہ ہم انھیں چند اشعار کو سامنے رکھ کر غالب کے ذوقِ شاعری کے متعلق یہ فیصلہ کر دیں کہ غالب صرف صوفی، فلسفی و الہیاتی شاعر تھا جیسا کہ بعض حضرات نے ظاہر کیا ہے۔ تاہم اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس کے یہاں تصوف و الہیات کے جو خیالات ملتے ہیں وہ بڑے لطیف و پاکیزہ ہیں جس کا خود اس کو بھی پورا پورا احساس تھا اور اسی لیے اس نے یہ پیشین گوئی بھی کر دی تھی کہ :-

شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

غالب کو زندگی بھر یہی شکوہ رہا کہ اس کا صحیح قدر شناس کوئی نہیں، چنانچہ ایک جگہ اس پر اظہارِ تاسف کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

"حیف کہ ابنائے روزگار، حسنِ گفتارِ مرا نشناختند۔ مرا خود دل بر آنان می سوزد کہ کامیاب شناسائے فرۂ ایزدی نگشتند و زیں نمایشہائے نظر افروز کہ در نظم و نثر بکار بردہ ام، سرگراں گذشتند"

مولانا حالی نے غالب کے مرتبۂ شاعری اور اس کی کس مپرسی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :-

"وہ شخص جس کا قصیدہ انوری و خاقانی کے قصیدوں سے ٹکر کھاتا ہے جس کی غزل عرفی و طالب کی غزل سے سبقت لے جاتی ہے جو رباعی میں خیام کی آواز میں آواز ملاتا ہے اور جس کی نثر کے آگے ابوالفضل اور ظہوری کی نثر پھیکی و بے مزہ معلوم ہوتی ہے اس کو بادشاہ ظفر کی سرکار سے صرف ۵۰ روپیہ ماہوار ملتا تھا اور وہ بھی ۶-۷ برس سے زیادہ نہ ملا۔"

غالب کی کس مپرسی کا یہ عالم اُس وقت کی بات ہے جب فارسی کا ذوق ملک میں مائل بہ انحطاط ضرور تھا لیکن ختم نہ ہوا تھا اور آزردہ، صہبائی، مومن، حسن، داؤد

میر وغیرہ ایسے شعراء فارسی موجود تھے۔ اس لیے غالب کو سمجھنا چاہیئے تھا کہ جب خود ان کے زمانہ میں "غالب سخن کم تھے" تو آئندہ اس کی کیا توقع ہو سکتی تھی لیکن ایسا سمجھتے ہوئے اسے دکھ ہوتا تھا اور اسے یقین نہ آتا تھا کہ قدرت اتنی بے رحم ہو سکتی ہے کہ ایسی جنس گرانمایہ کو ہمیشہ کے لیے ختم ہو جانے دے اور اسی اعتماد نے اس سے کہلوا دیا کہ

شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ غالب کی یہ تمنا پوری ہو کر رہی اور اس شان کے ساتھ کہ اس کے ہمعصر شعراء میں آج جو درجہ قبول اسے حاصل ہے وہ کسی اور کو نصیب نہ ہو سکا۔ اس کی زندگی کا کوئی رخ ایسا نہیں جس پر گفتگو نہ کی گئی ہو اور اس کی شاعری کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس پر اکابر علم و ادب نے بار بار اظہار خیال نہ کیا ہو۔ گو یہ بات ضرور ہے کہ غالب کو زیادہ تر ناز اپنی فارسی شاعری پر تھا جسے وہ "نقشہائے رنگ رنگ" کہتا ہے، اور شہرت اسے حاصل ہوئی اردو کے "مجموعۂ بے رنگ" سے جس کا سبب غالباً یہ ہے کہ فارسی ذوق غالب کے بعد تقریباً مفقود ہو چکا تھا اور اردو ارتقائی دور سے گزر رہی تھی۔

فارسی شاعری غالب کی فطری ودیعت تھی جس کو ترقی دی محض اس کے ذوق نے چنانچہ وہ خود ایک جگہ لکھتا ہے کہ:-

"شیخ علی حزیں نے مسکرا کر میری بے راہروی مجھ کو جتائی، طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادہ فنا کر دیا، ظہوری نے اپنے کلام کی گیرائی سے میرے بازو پر تعویذ اور کمر میں زاد راہ باندھا، اور نظیری نے اپنی روش خاص پر مجھ کو چلنا سکھایا۔ اب اس گروہ والا شکوہ کے فیض تربیت سے میرا کلک رقاص چال میں کبک

ہے نوراگیں موسیقار، جلوے میں طاؤس ہے تو پرواز میں عنقا۔"

(یادگار غالب)

غالب کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کن کن اساتذۂ فارسی سے استفادہ کیا۔

اپنے اشعار میں جا بجا وہ ان اساتذہ فارسی کا ذکر بھی کرتا ہے ایک جگہ ظہوری کو اس طرح یاد کرتا ہے:-

مارا اندر زفیض ظہوری ست در سخن

دوسری جگہ صائب و ظہوری دونوں کا ذکر ایک ساتھ اس طرح کرتا ہے:-

ذوق فکر غالب را بردہ ز انجمن بیرون   با ظہوری و صائب محو ہمزبانیہاست

ایک شعر میں وہ اپنے آپ کو عرفی کا جانشین قرار دیتا ہے:-

چوں ناز دسخن از مرحمت دہر بخویش   کہ بردِ عرفی و غالب بعوض باز دہد

ایک اور جگہ اپنے آپ کو نظیری کا ہمسر قرار دیتا ہے۔

زفیض نطق خویشم با نظیری ہمزبان غالب   چراغے را کہ دودے ہست در سر زود درگیرد

غالب نے اپنی ابتدائی تعلیم کا ذکر کھل کر کہیں نہیں کیا، لیکن کلاسکل فارسی کی تعلیم یقیناً ہوئی ہوگی، کیونکہ اس وقت کا عام نصاب یہی تھا، رہا یہ سوال کہ غالب کو اتنا بلند و پاکیزہ ذوق فارسی کا کہاں سے ملا۔

غالب نے اپنی تعلیم کے سلسلہ میں ایک جگہ کسی ایرانی نژاد عبدالصمد کا ذکر ضرور کیا ہے جس سے غالب نے دو سال تک "حقایق و دقایق زبان پارسی" معلوم کئے۔ لیکن کسی زبان کے محض "حقایق و دقایق" معلوم کر لینا ایک شخص کو ادیب و شاعر نہیں بنا سکتا، اس لیے صحیح بات وہی ہے جو غالب نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ:- "فارسی میں مبداء فیاض سے مجھے وہ دستگاہ ملی ہے کہ اس زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر

ہیں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر" اور یہی فطری مناسبت تھی جس نے غالب کو تمام ایرانی شعراء کی صف میں بھی خاص جگہ دی۔ ہو سکتا ہے کہ میرے اس خیال سے سب کو اتفاق نہ ہو لیکن اگر شعرائے ایران کے کلام سے "زمودہائے غالب" کا موازنہ کیا جائے تو اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ غالب بڑی چیز تھا۔

یوں تو فارسی تذکروں میں بہت سے ایرانی شعراء کا نام نظر آتا ہے، لیکن پچھلے تیرہ سو سال میں کتنے شاعر ایران نے ایسے پیدا کئے جن کو دنیا نے یاد رکھا، اس کا جواب بہت مایوس کن ہے۔

فارسی شاعری کا اسلامی دور تیسری صدی ہجری یعنی دولت عباسیہ کے زوال سے شروع ہوتا ہے، جب خراسان میں طاہر ذوالیمینین ایک خودمختار سپہ سالار کی حیثیت سے مامور تھا۔ لیکن طاہری دور میں ہمیں کسی قابل ذکر شاعر کا نام نظر نہیں آتا۔ اس کے بعد سامانی خاندان کی حکومت میں بھی صرف دو قابل ذکر شاعروں کا نام نظر آتا ہے، رودکی جسے فارسی غزل کا ابوالآباء سمجھا جاتا ہے اور دقیقی جس نے شاہنامہ کی ابتداء کی تھی۔

غزنوی دور فارسی شاعری کے لیے زیادہ خوشحالی کا دور تھا، لیکن دو صدی کے اس طویل دور میں جتنے شاعر پیدا ہوئے ان میں فردوسی کے علاوہ کوئی قابل ذکر نہیں، البتہ ادب قدیم کے مطالعہ کے سلسلہ میں عنصری، فرخی، اسدی اور منوچہری پر بھی ایک سرسری نگاہ ڈال لی جاتی ہے، لیکن غائر مطالعہ صرف فردوسی کا کیا جاتا ہے۔

جب پانچویں صدی ہجری میں غزنوی حکومت کو زوال شروع ہوا تو فارسی شاعری پر بھی اس کا اثر پڑا، لیکن زیادہ دن نہ گزرنے پائے تھے کہ سلجوقی حکومت کا دور شروع اور سلطان سنجر کا دربار پھر شعر و ادب کا مرکز بن گیا، لیکن اس مرکز سے بھی

نظامی، خاقانی اور انوری کے علاوہ کوئی تیسرا ایسا نہ اٹھا جس کو یاد رکھا جائے۔

اس کے بعد تاتاری فتنہ شروع ہوا اور فارسی شاعری کا پچھلا دور بھی ختم ہوا جس میں سوائے قصیدہ و مثنوی کے ہمیں کچھ نظر نہیں آتا، جب دنیا نے پھر اطمینان و سکون کی سانس لی، تو ترکوں اور مغلوں کا زمانہ تھا اور اسی دور میں غزل کا صحیح مفہوم متعین ہوا، لیکن آپ یہ سن کر حیرت کریں گے کہ سوائے سعدی اور حافظ کے تیسرے غزل گو کا نام اس عہد میں بھی نہیں لیا جاسکتا (امیر خسرو بھی اسی دور کے شاعر تھے لیکن وہ ہندوستان کے تھے، ایران کے نہ تھے) تصوف میں بے شک عطار، عراقی، مولانا روم اور اوحدی نے کافی شہرت حاصل کی اور قصیدہ گوئی میں کمال اسماعیل اور سلمان ساوجی نے نام پیدا کیا، لیکن تغزل کا سرمایہ صرف سعدی و حافظ تک محدود تھا۔

اب وہ زمانہ آیا جب ایران میں صفوی خاندان برسر حکومت تھا اور ہندوستان میں تیموری خانوادہ ـــ وہ بھی علم و ادب کا قدر شناس، یہ بھی فضل و کمال کا جوہری لیکن سلاطین تیموریہ کی حکومت و دولت وسیع تھی اس لیے صفوی خاندان اس مقابلہ میں کامیاب نہ ہوسکا اور سرزمین ایران کے بہترین شعراء کھنچ کھنچ کر ہندوستان پہونچ گئے، لیکن ان "ایران نژاد" بہترین شعراء میں سے آج کتنوں کا نام زندہ ہے؟ صرف پانچ کا۔ یعنی عرفی، نظیری، طالب آملی، صائب اور ابوطالب کلیم (فیضی بھی اسی دور کا شاعر ہے لیکن ایرانی نہیں تھا۔ اس لیے اس کا نام اس سلسلہ میں نہیں لیا جاسکتا۔)

ابوالفضل نے آئین اکبری میں دربار شاہی تک پہونچنے والے شاعروں کی طویل فہرست دی ہے، لیکن ان پانچ کے سوا کوئی مشہور نہیں، ہر چند مغلوں کی حکومت ہندوستان میں عرصہ تک رہی، لیکن شاعری کے لحاظ سے جہانگیری عہد، فارسی شاعری کا آخری عہد تھا جس کے بعد کوئی مشہور شاعر نہ ایران میں پیدا ہوا نہ ہندوستان آیا۔

اب غور فرمائیے کہ تیسری صدی سے لے کر گیارھویں صدی کے وسط تک تقریباً ایک ہزار سال کی مدت میں ایران نے جتنے قابل ذکر شاعر پیدا کئے ان کی فہرست یہ ہے:۔ رودکی، دقیقی، فردوسی، نظامی، خاقانی، انوری، سعدی، حافظ، کمال اسماعیل، صائب، عرفی، نظیری، طالب آملی، اور ابوطالب کلیم، اور جب ہم ہندوستان کے کسی فارسی شاعر کا ذکر کرتے ہیں تو مقابلتاً انھیں پندرہ ایرانی شاعروں میں سے کسی کا نام لیا جاتا ہے۔ یعنی اگر مثنوی کا ذکر آتا ہے تو فردوسی و نظامی سامنے آجاتے ہیں، قصیدہ کی بحث ہوتی ہے تو خاقانی و انوری کا کلام پیش کیا جاتا ہے اور غزل میں سعدی، حافظ، عرفی، نظیری، اور صائب و کلیم کا۔ (خسرو و فیضی ایرانی نہ تھے اس لیے ان کا نام میں نے نہیں لیا۔)

اگر خسرو کو علیحدہ کر دیا جائے جنھوں نے خلجیوں اور تغلقوں کا عہد بھی دیکھا تھا تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان میں فارسی شاعری کا عام ذوق مغلیہ عہد سے شروع ہوا اور اسی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اکبر و جہانگیر کے زمانہ میں اس کا شباب تھا اور شاہجہاں کے بعد سے اس میں انحطاط ہونا شروع ہوا، یہاں تک کہ عہد مغلیہ کے اختتام تک (تقریباً دو صدی کے اندر) شاہجہاں کے آخری زمانہ میں صرف ایک بیدل پیدا ہوا اور بہادر شاہ کے زمانہ میں غالب۔ ہر چند دو سو سال کے اندر ہندوستان میں فارسی کے صرف دو قابل ذکر شاعروں کا پیدا ہونا کوئی عجیب بات نہیں، لیکن حیرت تو ایران پر ہے کہ وہ بھی اس زمانہ میں کوئی شاعر پیدا نہ کر سکا اور اس سے قبل بھی جب وہاں اس پیداوار کی کمی نہ تھی تو ایک ہزار سال کے اندر قابل ذکر شاعروں کی تعداد وہاں پندرہ سے آگے نہ بڑھ سکی۔

اس سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ صحیح معنی میں شاعر مشکل ہی سے کوئی پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے اگر ہم ایران کے مقابلہ میں (جس نے ایک ہزار سال میں صرف پندرہ شاعر

پیدا کیے) ہندوستان کی طرف سے چار پانچ صدی کے اندر پانچ شاعروں کا نام بھی پیش کر سکیں تو یہ کوئی معمولی بات نہ ہوگی۔ آپ کو یہ سن کر حیرت نہ کرنا چاہیے کہ ہندوستان کے انھیں پانچ مشہور شاعروں میں ایک غالب بھی تھا۔

ہندوستان کا سب سے پہلا فارسی شاعر جس کا جواب جامعیت کے لحاظ سے ایران کی سرزمین بھی پیش نہیں کر سکی، خسرو تھا۔ ان کی شاعری و زباندانی کا یہ مرتبہ تھا کہ عرفی، حافظ اور جامی کو اس کا اعتراف کرنا پڑا اور اگر ہم تمام اُن علوم و فنون کو سامنے رکھیں جن کے وہ ماہر تھے، تو ایران کے تمام شعراء مل کر بھی خسرو کے پلہ کو ہلکا نہیں کر سکتے۔

فارسی شاعری میں انھوں نے غزل، مثنوی، قصیدہ سبھی کچھ کہا اور جو کچھ کہا وہ ایران کے بہترین غزل کہنے والوں، مشہور مثنوی لکھنے والوں اور بلند ترین قصیدہ سنجوں کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا ہندی نژاد شاعر جس نے ایرانی شاعروں سے اپنا لوہا منوالیا، فیضی تھا۔ یہ بھی اپنی جامعیت کے لحاظ سے دربار اکبری کے تمام شاعروں پر بھاری تھا اور ایک غزل کو چھوڑ کر کہ اس میں تو بیشک وہ عرفی اور نظیری کے پایہ پر نہیں پہونچتا ورنہ اور تمام اصناف سخن میں اُستادانہ حیثیت کا مالک تھا۔

تیسرا شاعر جس کی شاعری معنوی حیثیت سے اپنا جواب نہیں رکھتی میرزا عبدالقادر بیدل تھا۔ یقیناً بیدل کی شاعری ایرانی محاورات کی شاعری نہیں، لیکن جو زبان اس نے پیدا کی اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ بیدل ہی کے ساتھ ہم کو میرزا مظہر جانجاناں کا نام بھی لینا چاہیے جن کی غزل گوئی میں سعدی و مابعد سعدی دونوں زبانوں کا رنگ گویا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہندوستان کا صرف ایک شاعر رہ جاتا ہے، جسے ہم ایران کے مقابلہ میں پیش کر سکتے ہیں اور وہ غالب ہے جسے اُن کی زباندانی اور معمولات شعری کے لحاظ

سے اُن ایرانی شعراء کی صف میں جگہ دینی چاہیے جو اکبر و جہانگیر کے دربار سے وابستہ تھے اور جن کی شاعری آج بھی متاعِ گراں ارز سمجھی جاتی ہے۔

یوں تو شاعری کے تمام اصناف کا تعلق صرف طرزِ ادا و اندازِ بیان سے ہے، لیکن غزل کی کامیابی خصوصیت کے ساتھ اسی پر منحصر ہے کیونکہ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ مکمل ہوتا ہے اور جب تک حسنِ ادا سے کام نہ لیا جائے اس میں کوئی خاص بات پیدا نہیں ہوتی۔

غزل کا موضوع یقیناً حسن و عشق کی دنیا کو صرف عجز و افتادگی یا زاری و تضرع تک محدود سمجھنا درست نہیں، محبت کرنے والا بہرحال انسان ہوتا ہے اور تمام ان جذبات کا حامل ہوتا ہے جو فطرتاً ایک انسان میں پائے جانے چاہییں۔ البتہ فرق اس بات میں ہوتا ہے کہ کسی میں کوئی خاص جذبہ زیادہ قوی ہوتا ہے اور کسی میں ضعیف اور اسی جذبہ کی قوت و ضعف کے لحاظ سے اس کا رنگ شاعری متعین ہوتا ہے۔

چونکہ سعدی میں جذبۂ سپردگی و فتادگی زیادہ قوی تھا۔ اس لیے ان کے اسی رنگ کے اشعار زیادہ کامیاب ہوئے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس مخصوص جذبہ سے ہٹ کر جو کچھ کہا جائے گا وہ شاعری یا تغزل سے یکسر خارج سمجھا جائے گا۔

سعدی و حافظ کے زمانہ کا اندازِ سخن ایرانی شاعری کے دورِ آخر میں بہت کچھ بدل گیا تھا، اس لیے طرزِ ادا اور اسلوبِ بیان کے لحاظ سے سعدی و حافظ کا مقابلہ عرفی و نظیری سے کرنا بھی غلطی ہے چہ جائیکہ غالب سے، جو سعدی و حافظ کے صدیوں بعد پیدا ہوا تھا، لیکن "روحِ تغزل" کے لحاظ سے یقیناً یہ مقابلہ درست ہو سکتا ہے۔

غالب کا تغزل

سعدی سے پہلے بھی فارسی میں غزل گوئی پائی جاتی تھی، لیکن کم اور غیر ترقی یافتہ، اور اس کا سبب یہ تھا کہ غزل کے لیے جس زبان کی ضرورت ہے وہ پیدا نہ ہوئی تھی اور عام طور پر شعراء قصائد کی طرف مائل تھے۔ سعدی کی شہرت غزل گو ہونے کی حیثیت سے صرف اسی بنا پر قائم ہوئی

انھوں نے دیگر اصناف شاعری کے ساتھ غزل کی طرف بھی کافی توجہ کی اور چوں کہ فطرتاً عاشقانہ ذوق اور دردمند دل رکھتے تھے اس لیے اُن کے تغزل میں وہ سوز و گداز پیدا ہو گیا جو اس سے پہلے دوسرے شعراء کے کلام میں مفقود تھا۔ علاوہ اس کے زبان بھی اُن کے زمانہ میں اتنی سادہ ہو چکی تھی کہ جذبات محبت کا اظہار بے تکلفی سے ہو سکتا تھا۔

غالب یقیناً سعدی کے رنگ کا شاعر نہ تھا، یعنی عشق کی وہ شدید کیفیت وہ شیفتگی و ربودگی، وہ سپردگی و نشادگی جو واقعی تغزل کی جان ہے اور سعدی کے یہاں بہت نمایاں طور پر نظر آتی ہے، غالب کے یہاں اتنی شدت کے ساتھ نہیں پائی جاتی، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ غالب کے یہاں یہ چیز سرے سے مفقود ہے، درست نہیں۔

اول تو فارسی زبان میں غالب کے زمانہ تک بہت کچھ تغیر ہو گیا تھا اور اسی کے ساتھ انداز بیان اور لب و لہجہ بھی کچھ اور ہو گیا تھا۔ علاوہ اس کے چونکہ غالب فطرتاً زیادہ شوخ و خوددار تھا، اس لیے سعدی کی سی بیچارگی و بیکسی تو اس میں نہیں ہے لیکن وارداتِ محبت کے اظہار کی اور جتنی صورتیں ہو سکتی ہیں وہ سب اس کے یہاں نہایت تکمیل کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔

سعدی کے تغزل میں تین رنگ کے اشعار پائے جاتے ہیں، ایک وہ جن میں غمزدہ نشادگی کا اظہار کیا گیا ہے۔ دوسرے وہ جن میں تمثیلی رنگ اختیار کیا گیا ہے اور تیسرے وہ جن کا تعلق جدتِ ادا سے ہے۔ ان کے پہلے رنگ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

من چہ در پائے تو ریزم کہ خورائے تو بود ۔۔۔ سر نہ چیزیست کہ شایستہ پائے تو بود

حدیث حسن خود از دیگراں پرس ۔۔۔ کہ سعدی در تو حیران ست و مدہوش

او خود گر بہ لطف خداوندے کند ورنہ زما چہ بندگی آید پسند او

ہر کہ می بینیدم از بار غمت می گوید سعدیا بر تو چہ رنج ست کہ بگداختہ

ترا چہ غم کہ مرا در غمت نگیرد خواب تو بادشاہ، کجا یاد پاسبان آری

اس میں شک نہیں کہ ان اشعار میں نہایت سادگی و عزبت کے ساتھ جذبات عشق کا اظہار کیا گیا ہے اور یہ رنگ سعدی کے ساتھ ختم ہوگیا۔ لیکن غالب کے یہاں بھی اس رنگ کے اشعار کچھ کم سوز و گداز کے ساتھ کافی تعداد میں مل سکتے ہیں:۔

جانِ غالب، تاب گفتار ے، گمانداری ہنوز سخت بیدردی کہ می پرسی ز احوالِ ما

تم مجھ سے میرا حال پوچھتے ہو! شاید تم سمجھتے ہو کہ مجھ میں تم سے تاب گفتگو ابھی تک باقی ہے۔ اُف ری بے دردی!۔ اظہار بےکسی و بیچارگی کی ایک اور دلکش مثال ملاحظہ ہو:۔

خرسندی غالب بنود زیں ہمہ گفتن یکبار بفرمائے کہ "اے بیکسِ ما"

حالِ دل کے اظہار میں عاشق عجیب عجیب باتیں کہتا ہے اور مختلف طریقوں سے محبوب کو اپنی محبت کا یقین دلانا چاہتا ہے، غالب جس سادگی مگر قوت کے ساتھ اس کا ذکر کرتا ہے وہ اسی کا حصہ ہے، لکھتا ہے:۔

پہلو بشگافید و بہ بینیم دلم را تا چند بگویم کہ چنان ست و چنان نیست

سوزشِ محبت کے اظہار میں عام طور پر شعراء آتش و برق یا ان کے متعلقات سے استعارہ کیا کرتے ہیں اور یہ ایسی پیش پا افتادہ بات ہے کہ اس سے کوئی لطف حاصل نہیں ہوتا۔ چنانچہ سعدی کہتے ہیں:۔

در سوختہ پنہاں نتواں داشتن آتش ما ہیچ نگفتیم و حکایت بدر افتاد

میں نے کسی سے کچھ نہ کہا اور میرے جلنے کا حال سب کو معلوم ہوگیا، سچ ہے اس آگ کو چھپانا ممکن نہیں ہے لیکن غالب اسی خیال کو زیادہ بہتر انداز میں

یوں ظاہر کرتا ہے۔

نہ بدرجستہ شرارہ نہ بجا ماندہ رماد   سوختم لیک نہ دانم بچہ عنوانم سوخت

نہ چنگاریاں اٹھتی ہوئی نظر آئیں اور نہ راکھ ہی کا کہیں پتہ ہے۔ پھر، یہ تو یقینی ہے کہ میں جلا، لیکن جلانے والے نے مجھے کس طرح جلایا، اس کو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

زندگی سے بیزاری کا اظہار سبھی شعراء کرتے ہیں، لیکن غالب کا اندازِ بیان ملاحظہ ہو۔

دربغل دشنہ نہاں ساختہ غالب امروز   مگزارید کہ ماتم زدہ تنہا ماند

غالب نے صرف لفظ "ماتم زدہ" میں جذبات کا وہ طوفان سمیٹ کر رکھدیا ہے، جس کے اظہار کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ تغزل کے سلسلہ میں کبھی کبھی شاعر ادبیات سے ہٹ کر، کائناتی رنگ اختیار کرلیتا ہے۔ اس کی مثال میں غالب کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

مقصود ما زدیر و حرم جز حبیب نیست   ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

سعدی کے رنگ تغزل میں غالب کی ایک ہی غزل کے چند اشعار اور دیکھئے:۔

بیا، و جوشِ تمنائے دیدنم بنگر   چو اشک، از سرِ مژگاں چکیدنم بنگر

زمن بجرمِ تپیدن کنارہ می کردی   بیا بخاکِ من و آرمیدنم بنگر

شنیدہ ام کہ نہ بینی و ناامیدنیم   نہ دیدنِ تو شنیدم، شنیدنم بنگر

چند اشعار اور ملاحظہ ہوں۔

بلبل بہ چمن بنگر و پروانہ بہ محفل   شوق است کہ در وصل ہم آرام ندارد

قدر مشتاقاں چہ داند دربا چیزش بود   آنکہ دایم کار با ذلہائے خرسندش بود

گاہ گاہ از نظرم مست و غزلخواں بگذر   ورنہ بر عہدۂ من نیست کہ رسوا باشم

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا

از دل تست آنچہ بر سر من می رود می شناسم سختی ایام را

شیخ سعدی نے اس رنگ کے علاوہ محاکات و معاملات، تشبیہات و استعارات تعبیرات و ظریفات کی بھی شاعری کی ہے، لیکن غالب کے یہاں یہ باتیں بہت کثرت و تنوع کے ساتھ پائی جاتی ہیں ــــ سعدی کے تمثیلی رنگ کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

لبت بدیدم و لعلم بیوفتاد از چشم سخن بگفتی و قیمت برفت لولو را

اے کہ بحسن قامتت سرو ندیدم سہی گرہمہ دشمنی کنی از ہمہ دوستاں بہی

سروے بلب جوئے گویند چہ خوش باشد آنانکہ ندیدستند سروے بلب بامے

آپ نے دیکھا کہ یہ اشعار اُن کے حقیقی رنگ کے مقابلہ میں کتنے کمزور اور کسقدر بےمزہ ہیں، لب کو لعل، دانتوں کو موتی اور قد کو سرو، سعدی سے پہلے بھی کہا جاتا تھا، انھوں نے اس میں کوئی جدت پیدا نہیں کی، بجز اس کے کہ اندازِ بیان اور سلاست سے ان میں تھوڑی بہت جان پیدا کر دی ہے۔

غالب کے یہاں بھی سادہ تشبیہات و استعارات بہت کم ہیں بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ اس چیز کو اپنے آرٹ سے فروتر سمجھتا تھا، اسی لیے اس نے اگر تشبیہات و استعارات سے کام لیا بھی تو ایسے انداز کے ساتھ کہ ان کی صورت تعبیرِ شاعرانہ کی سی ہو گئی ہے جو تشبیہ و استعارہ سے مختلف ہے مثلاً

اے گردِ راہ تو بہ جہاں نوبہارِ حسن
جلوہ رطوبہ بہ آرائشِ بزمش مشغل

زموجِ گل بہاراں بستہ زنار
بہارِ بستر و نوروزِ آغوشش

تو گوئی موجے از دریائے نور ست

غبارِ رہش سیمیائے بہشت

ان مصرعوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی شاعری کا تمثیلی رنگ کس قدر لطیف و دلکش ہے یہ رنگ سعدی کے یہاں تو خیر کم ہونا ہی چاہئے تھا کیوں کہ انھوں ہی نے اس کا آغاز کیا تھا لیکن حیرت تو یہ ہے کہ عرفی، نظیری، طالب آملی اور ابوطالب کلیم کے یہاں بھی کم نظر آتا ہے۔ صائب نے البتہ اس تمثیلی انداز کو زیادہ کامیابی کے ساتھ اختیار کیا، لیکن اکثر جگہ تغزل سے ہٹ کر۔ مثلاً:۔

عرق زروئے تو کردہ است گل بدامن پاک	ز شبنم است چمن را بروئے آتشناک
پائے بوس سیل از پا افگند دیوار را	بر تملق ہائے دشمن تکیہ کردن ابلہی ست
لالۂ چند کہ از دامنِ صحرا برخاست	یادگار جگر سوختۂ مجنون است
چو زن پستان خود مالد خطوط نفس کے باید	ثنائے خود بخود گفتن نمی زیبد ترا صائب

لیکن جس جگہ وہ تغزل کے حدود میں رہ کر اس رنگ سے کام لیتا ہے زیادہ دلکش ہو جاتا ہے مثلاً:۔

ہر کہ برخاست زجا سلسلہ برپا برخاست	شب کہ صحبت بہ حدیث سر زلف تو گزشت

"حسنِ تعبیر" کے یہاں یہ رنگ، جیسا کہ ہم نے ابھی ظاہر کیا بہت پاکیزہ و نادر ہے اس کا خاص سبب ہے۔

"حسنِ تعبیر" کا تعلق زبان سے اتنا نہیں ہے، جتنا "تخیل" سے اور چونکہ غالب نے "تخیل" میں مرزا عبدالقادر بیدل سے استفادہ کیا تھا جو اس رنگ کا بادشاہ تھا، اس لیے ظاہر ہے کہ متقدمین میں سے کوئی اس کے مقابل نہ ٹھہر سکتا تھا۔

غالب کے جو مصرعے ہم نے سطور بالا میں نقل کئے ہیں، ان کی ترکیب سے بھی "بیدلانہ" رنگ ظاہر ہے، لیکن چند مثالیں اور ملاحظہ ہوں:۔

شانِ ماضی دگر استادگی مستقبل

مصرعہ کا دوسرا ٹکڑا بالکل بیدل کی زبان ہے۔

قطرگی بگذار تا عماں شوی

الفاظ و خیال دونوں بیدل کے ہیں۔

رنگِ سنگم شرارے می نویسم   کفِ خاکم غبارے می نویسم

شرار نوشتن اور غبار نوشتن قسم کی جدتیں بیدل کی خصوصیات ہیں۔

کتانِ خویشتن می شویم بہ مہتاب

ہوا کردہ اند آشکارا بر من

در آفاق طرحِ پریخانہ ریخت

بہر ذرہ خورشید می ریختند

نفس ز خوئے تو گلدستہ بند رنگینی   نگہ ز روئے تو آئینہ دار حیرانی

خون گشتہ ایم و باغ و بہار خودیم ما

ہلاکم جلوۂ برق شراب گاہ گاہی را

بر سرم ز آزادی سایہ را گرانیہا ست

بر خویشتن ز آبلہ چیزے فزودہ

خطے بہ ہستی عالم کشیدیم از مژہ بستن   ز خود رفتیم و ہم با خویشتن بردیم دنیا را

زاہد منا ز چند ہیں زنارم از گسستنی   از جبہ ام ندوزد کس سجدۂ صنم را

ندانم تا چساں از عہدۂ درویش بر آیم   ز شادی جاں بہا گفتم متاعِ کم بہائش را

تا چہا آئینۂ حسرتِ دیدار توام   جلوہ بر خود کن و دارا بنگاہے دریاب

ز لکنت می تپد نبض رگِ لعل گہر بارش   شہیدِ انتظار جلوۂ خویش ست گفتارش

ان تمام مصرعوں اور شعروں کی ترکیبیں بیدل کے مطالعہ کا نتیجہ ہیں اور اسی لیے غالب

کا تخیلی رنگ معنوی حیثیت سے بعض جگہ بہت گہرا نظر آتا ہے، لیکن اس سے یہ سمجھنا چاہیئے کہ بیدل رنگ سے ہٹ کر اس نے تخیلی شاعری کی ہی نہیں۔ اس رنگ میں اس کی انفرادیت ذیل کے اشعار سے ظاہر ہوتی ہے۔

نازم فروغ بادہ، ز عکس جمال دوست   گوئی فشردہ اند بجام آفتاب را

روئے محبوب کے عکس سے شراب کی تابش کا بڑھ جانا اور اس کی یہ تعبیر کرنا گویا پیالہ میں آفتاب نچوڑ کر رکھ دیا گیا ہے، خاص غالب کی چیز ہے۔

سرگرمی خیال تو از نالہ باز داشت   دل پارہ آتشے ست کہ دودش نماندہ است

وہ دل جو نالہ نہ کر سکے، اس کی مثال ایسی آگ سے دینا جو دھواں دینا چھوڑ چکی ہے، حسن تعبیر کی ایسی پاکیزہ مثال ہے کہ مشکل ہی سے اس کی نظیر کہیں مل سکتی ہے۔

جلوہ کن منت منہ، از ذرہ کمتر نیستم   حسن با ایں تابناکی آفتاب بیش نیست

جلوۂ محبوب کو تابش آفتاب سبھی نے کہا ہے، لیکن غالب نے اپنے انداز بیان سے اسی پامال مضمون کو خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ کہتا ہے:۔ "سامنے آئے اور آپ کا سامنے آنا مجھ پر کوئی احسان نہ ہوگا، کیونکہ آپ کی جلوہ نمائی زیادہ سے زیادہ تابش آفتاب ہی ہو سکتی ہے اور میں بہرحال ذرہ سے کم تو ہوں نہیں کہ اس کی تاب نہ لا سکوں"۔

ز جوش دل منوز رشِ ریشہ در رگ بیدار کیا   بمژگاں قطرۂ خوں، غنچۂ ناچیدہ را ماند

مژگاں پر آئے ہوئے قطرۂ خون کو ایسی کلی سے تشبیہ دینا جو ابھی توڑی نہ گئی ہو، کتنا لطیف تصور ہے۔

اسی رنگ میں غالب کا ایک اور شعر سن لیجیے، جو تخیلی رنگ میں میرے نزدیک پورے دیوان کا حکم رکھتا ہے:۔

خوشی شمیمش ہیں، جنبش نسیمش ہیں غنچہ راست آہنگے، سرو راست رفتارے

شمیم کو "آہنگ غنچہ" اور جنبش نسیم کو "رفتار سرو" سے تعبیر کرنا نزاکت تخیل و پاکیزگی خیال کی حد ہے۔

اسی انداز کا ایک جملہ تفریحی نے باغ عباس آباد کی تعریف میں لکھا ہے:۔

صبح نسیمے ست از نسترن زارش گزشتہ وشفق ہوائے ست از لالہ زارش برگشتہ

یعنی صبح، جس چیز کا نام ہے وہ دراصل باد نسیم کی وہ موج ہے جو اس باغ کے نسترن زار سے ہو کر نکل گئی ہے اور جسے شفق کہتے ہیں وہ درحقیقت ہوا کا ایک جھونکا ہے جو اس کے لالہ زار سے چھو کر گزر گیا ہے۔

غالب کا ایک اور شعر اسی رنگ میں اس سے بہتر یہ ہے:۔

بازم بہ کلبہ کیست، نہ شمع و نہ آفتاب بام و درم ز ذرہ و پروانہ پر شدست

محبوب کو شمع و آفتاب سبھی نے کہا ہے، لیکن غالب نے پہلے مصرعہ میں جس "تجاہل عارفانہ" سے کام لیا ہے، اس نے اس تمثیل میں بالکل نیا رنگ بھر دیا۔

اس سلسلہ میں اردو کا بھی ایک شعر اسی انداز بیان کا سن لیجئے:۔

نگاہ برق نہیں، چہرہ آفتاب نہیں وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

اس سے قبل کے جتنے کے جتنے اشعار ہم نے نقل کئے ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی تمثیلی شاعری کتنی تابش و شگفتگی رکھتی ہے یہ رنگ سعدی کے یہاں تو بالکل نظر نہیں آتا اور اگر چند اشعار ملتے بھی ہیں تو اس رنگ کے:۔

دلِ سعدی ہمہ ز ایام بلا پرہیزد
سر زلف تو ندانم بچہ یارا بگرفت

خواجہ حافظ کے یہاں بھی یہ رنگ بہت کم ہے، البتہ عرفی و نظیری کے کلام میں اس کی کچھ مثالیں ملتی ہیں، لیکن کمیت و کیفیت دونوں حیثیتوں سے غالب کے مقابلہ میں کم۔

نظیری کے دو شعر تمثیلی رنگ کے ملاحظہ ہوں۔

همه شب بر لب و رخسار و گیسوی زنم بوسه گل و نسرین و سنبل را صبا در خرمن است امشب

محبت در دلِ غم دیده الفت بیشتر گیرد چراغی را که دودے هست در سر زود درگیرد

تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ امر مخفی نہیں کہ فارسی شاعری اور خصوصیت کے ساتھ غزل گوئی کو ترقی ایران میں نہیں بلکہ ہندوستان میں ہوئی، صفوی خاندان کی وجہ سے نہیں بلکہ مغلیہ قدردانیوں کی وجہ سے ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب ایران کے تمام اہل کمال شعراء کھنچ کھنچ کر یہاں آرہے تھے اور ہر امیر کا دربار، ان کی غزلخوانیوں کا مرکز تھا ایک دوسرے سے بازی لے جانے اور زیادہ رسوخ حاصل کرنے کے لیے ہر شاعر پوری کاوش کام لے رہا تھا اور اسلوب بیان میں طرح طرح کی جدتیں پیدا ہو رہی تھیں۔

سب سے بڑا دربار اکبر، جہانگیر و شاہجہاں کا تھا، اس لیے ہر شاعر کی دلی تمنا یہی تھی کہ وہ یہاں بار پا سکے اور جب اس میں کامیابی ہو جاتی تھی تو اسے دربار کے ملک الشعراء بننے کی خواہش ہوتی تھی، ظاہر ہے کہ یہ کشاکش معمولی نہ تھی اور اس مسابقت میں وہی شعراء حصہ لے سکتے تھے جو غیر معمولی فطانت و ذہانت کے مالک ہوں اور جو اپنے کلام سے بادشاہوں اور امیروں کو چونکا سکیں۔ چونکہ اکبر و جہانگیر دونوں کے دربار کے امراء خود بھی نہایت اچھا ذوق سخن رکھتے تھے اس لیے ان سے وہی شاعر داد لے سکتا تھا جو واقعی اس کا اہل ہو۔ الغرض فارسی شاعری کا بہترین دور عہد مغلیہ کا دور تھا اور اسی زمانہ کے مشہور شاعروں کے کلام کو معیار قرار دے کر ہم متاخرین کے کلام کے حسن و قبح پر حکم لگا سکتے ہیں۔

یوں تو اکبر و جہانگیر کے زمانہ میں ایران کے بہت سے شاعر یہاں آئے اور کچھ نہ کچھ قدر بھی کی ہوئی، لیکن جو عزت و شہرت عرفی، نظیری، طالب آملی، صائب

اور ابو طالب کلیم کو نصیب ہوئی وہ کسی دوسرے کو حاصل نہ ہو سکی اور جس وقت ہم ان حضرات کے کلام کے ساتھ ساتھ غالب کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ وہی تمام خوبیاں جو عرفی و نظیری وغیرہ کے یہاں شاہانِ مغلیہ کی انتہائی قدر دانی کے زمانہ میں پائی جاتی تھیں، غالب کے کلام میں کیونکر پیدا ہو گئیں، جبکہ قدر دانی کیسی، کوئی اس کی زبان سمجھنے والا بھی یہاں موجود نہ تھا۔

تمام نقادانِ سخن کا متفقہ فیصلہ ہے کہ کلام کی خوبی صرف جدّت ادا اور روانی کلام سے ہے، یعنی ایک ہی خیال کو نئے نئے زاویوں سے پیش کرنا اور ایسی زبان میں جو ہموار و مترنم ہو اور اس کے پڑھنے سے کسی قسم کا ثقل محسوس نہ ہو۔

سعدی کے زمانہ تک غزل میں جدّت ادا و براعتِ تعبیر کا رواج نہ ہوا تھا، بلکہ محض سادہ جذبات کو سادہ و شیریں زبان میں ادا کرنا ہی غزل کہلاتا تھا لیکن سعدی نے سادگی بیان کے ساتھ معاملہ بندی، محاکات کے ندرت بیان سے بھی کام لیا، جس کو خسرو اور حافظ نے کافی ترقی دی اور پھر رفتہ رفتہ اس نے ایرانی شاعری کے آخری دور (یعنی عرفی و نظیری کے زمانہ میں) ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کر لی اور حقیقت یہ ہے کہ غالب اسی رنگ کا بادشاہ تھا۔

فارسی کے مشاہیر غزلگو شعراء اور غالب

سعدی ـــــ سعدی کے یہاں معاملہ بندی و جدّتِ ادا کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

سعدیا نوبتے امشب دہلِ صبح نکوفت | یا مگر صبح نباشد شبِ تنہائی را

دل و جانم بتو مشغول و نظر در چپ و راست | تا ندانند حریفاں کہ تو منظورِ منی

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم | باید اوّل بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

دنبال تو بودن گنہ از جانبِ ما نیست | با غمزہ بگو تا دلِ مردم نرباید

زمین میرس کز اذیت او دلم چون ست　　　از و بپرس کہ انگشتہاش پُر خون ست

یقیناً ان تمام اشعار میں جدّت ادا سے کام لیا گیا ہے لیکن چونکہ سعدی کے زمانہ میں اس رنگ کا بالکل آغاز تھا، اس لیے ان اشعار کی حیثیت بھی سادہ نقوش سے زیادہ نہیں، البتہ جہاں کہیں عشق کی چاشنی شامل ہوگئی ہے وہاں سعدی کا یہ رنگ بھی چمک اٹھا ہے۔ مثلاً:-

جمال در نظر و شوق ہمچناں باقی　　　گدا اگر ہمہ عالم باو دہند گدا است

مضمون نہایت معمولی ہے لیکن اسلوب بیان کی جدّت اور لہجہ کے جوش نے اس شعر کو آسمان پر پہونچا دیا۔

خسرو — خسرو کا تغزل ہم کو اس لحاظ سے زیادہ ترقی یافتہ نظر آتا ہے کہ ان کے یہاں سوز و گداز تو سعدی کا سا ہے، لیکن اسلوب بیان کی جدّتیں ان کے یہاں بہ نسبت سعدی کے زیادہ دلنشیں و متنوع ہیں۔ مثلاً:-

جاں ز نظارہ خراب و ناز او ز اندازہ بیش　　　با بدیں گرمست و ساقی پُر دہد پیمانہ دار

تیے و آنت تقوی و آخر ایں نیدانی　　　کہ در شہر مسلماناں نباید ایں چنیں آمد

گفتم چگونہ می کشی و زندہ می کنی　　　از یک نگاہ کشت، و نگاہ دگر نکرد

می روی و گریہ می آید مرا　　　ساعتے بنشیں کہ باراں بگزرد

پہلے اور چوتھے شعر میں جو اسلوب بیان اختیار کیا گیا ہے، وہ سعدی سے ذرا مختلف اور نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ ہے۔

حافظ — حافظ کے یہاں بھی ہم کو جدّت ادا کی مثالیں ملتی ہیں، لیکن کم اور وہ بھی خاص رنگ کی مثلاً:-

ہر کس کہ بدید چشم او گفت　　　کہ محتسبے کہ مست گیرد

گر کند میلے بہ خوباں دل من خردہ مگیر　　　کیں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

پروانہ و شمع و گل و بلبل ہمہ جمع اند اے دوست بیا رحم بر تنہائی ما کن

عرفی و نظیری —— عہد مغلیہ کے زمانہ تک چونکہ زبان بہت ترقی کر گئی تھی اور نئے نئے اسلوب بیان کی اس میں کافی گنجائش پیدا ہو گئی تھی، اس لیے اس عہد کے شعراء نے تغزل میں بہت ترقی کی اور خصوصیت کے ساتھ عرفی اور نظیری نے جدتِ ادا کی بڑی اچھی اچھی مثالیں پیش کیں۔

عرفی کے چند اشعار ابداعِ بیان ملاحظہ ہوں :-

ساقی تو نوئے و سادہ دلی بیں کہ شیخ شہر باور نمی کند کہ ملک می گسار شد

تمام بود بیک حرف گرم دماغ قتل حکایتے کہ ہمہ ناتمام می گفتند

کلید میکدہ را بہ من دہید کہ من نہ آں کسم کہ باندازہ مست می گردد

مدار جلوہ دریغ از دلم کہ خرمنِ حسن بہ خوشہ چینی آئینہ کم نمی گردد

کمند کوتہ و بازوے سست و بام بلند ہمیں حوالہ و نومیدیم گنہ گیر ہو

فارغ ز خیرگی نگرد، روئے آفتاب ایں دیدہ آزمودۂ نظارہ کیست

آپ نے دیکھا کہ معمولی معمولی باتوں کو کیسے نئے نئے زاویہ سے پیش کیا ہے۔

نظیری کا ابداعی رنگ عرفی سے زیادہ دلچسپ تھا، کیونکہ اول تو وہ معاملۂ حسن و عشق کی چاشنی کو کسی جگہ ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا اور دوسرے یہ کہ اندازِ بیان کی جدت کے ساتھ اس نے ترکیبیں بھی نئی نئی ایجاد کیں، چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

از کف نمی دہد دلِ آساں ربودہ را دیدیم زور بازوے ناآزمودہ را

تا منفعل ز رنجش بیجا نہ بینمش می آرم اعتراف گناہ نبودہ را

ان شعروں میں دلِ آساں ربودہ — بازوئے ناآزمودہ اور گناہ نبودہ، ایسی ترکیبیں ہیں جو سعدی کے عہد میں رائج نہ تھیں اور مغلیہ عہد میں بھی ہر شاعر ان پر قادر نہ تھا۔

از یک حدیث لطف کہ آں ہم دروغ بود / اسشب زد فتر گلہ صد باب شستہ ایم
مردم از شرمندگی، تا چند بار بر تا کسے / بر دوست از دو رہنمایند و گویم "یار ہمست"
ہماں عشق است و بر خود بستہ چندیں داستاں ورنہ / کسے بر معنی یک حرف صد دفتر نمی ساند
من نخواہم رفت اما بہر تسکین دلش / ہر کجا بینید، گوئید شکہ زدد ای رود
مجلس چو بر شکستہ تماشا بہار رسید / در بزم چوں نشاند کسے، جا بہ بار رسید
گرچہ میدانم قسم خوردن بجانت خوب نیست / ہم بجان تو کہ یادم نیست سوگند دگر

نظیری کے ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلوب بیان میں جدت و ابداع کا اسے خاص سلیقہ حاصل تھا اور اگر ہم عرفی کے قصاید کو نظر انداز کر دیں۔ جن میں اس نے جدت ادا کی بڑی بڑی عجیب مثالیں پیش کی ہیں، تو اس باب میں نظیری کی فوقیت کو تسلیم کرنا پڑے گا۔

طالب آملی۔۔۔۔۔۔ یہ دربار جہانگیر کا ملک الشعراء تھا اور نہایت ذہین شخص تھا۔ اس کی شاعری بھی ندرت بیان و لطف استعارات کی تھی، اس کی یہ قوت زیادہ تر قصاید میں صرف ہوئی۔ تغزل میں اس کی جدت بیان کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی / دہن بر چہرہ زخمے بود و بہ شد
زغارت چمنت بر بہار منتہا ست / کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند
دو لب خواہم یکے در مے پرستی / یکے در عذر خواہیہائے مستی
با صد کرشمہ آں بت بدمست می رود / خود می کند خرام و خود از دست می رود

ابو طالب کلیم۔۔۔۔۔۔ یہ عہد شاہجہانی کا ملک الشعراء تھا، اور تغزل میں صائب کی خیال آفرینی کا متبع۔ جدت ادا کی مثالیں اس کے یہاں بھی ملتی ہیں، لیکن نظیری و عرفی سے کمتر و فروتر مثلاً:۔

شعلہ ہم می خواست از بے طاقتی دم می نشست / من نہ جنبیدم زجا تا جابہ گلخن داشتم

در منبع زمانہ قابل دیدن دوبارہ نیست روپس نہ کرد ہر کہ ازیں خاکداں گذشت

دارم رہے بہ پیش کز انگشت خارہا از من حساب آبلۂ پا گرفتہ است

غالب ـــــ آپ نے سعدی، خسرو، حافظ، عرفی، نظیری، طالب آملی، صائب اور ابوطالب کلیم کی جدت بیان و ندرت ادا کی مثالیں ملاحظہ فرمالیں۔ اب غالب کو بھی ملاحظہ فرمایئے۔

غالب کے کلیات فارسی میں قصائد، مثنوی، قطعات اور غزلیں سبھی کچھ موجود ہیں، اور ان میں سے کوئی صنف سخن ایسی نہیں جس میں اس نے جدت ادا و شوخی بیان سے کام نہ لیا ہو۔ چونکہ اس وقت موضوع بحث صرف غزل گوئی سے ہے اس لیے ہم اسی کو سامنے رکھ کر چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔

ابتدائی صفحات میں ہم بتا چکے ہیں کہ سعدی کا سادہ رنگ عشق تو غالب کیا کسی شاعر میں نہ پایا جاتا تھا اور تغزل کا وہ رنگ جسے دل کی بولی کہنا چاہیے سعدی کے ساتھ ختم ہوگیا۔ یہاں تک کہ خسرو بھی کوئی شعر ایسا نہ کہہ سکے جسے سعدی کے ان شعروں کے مقابلہ میں پیش کیا جاسکے۔

اے ساربان آہستہ راں کارام جانم می رود

اے تماشا گاہ عالم روئے تو تو کجا بہر تماشا می روی

دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تست تا نہ پنداری کہ تنہا می روی

لازم ست احتمال چندیں درد کہ محبت ہزار چندیں ست

لیکن اس رنگ سے ہٹ کر بیان و زبان کے لحاظ سے تغزل کی جتنی صورتیں ہو سکتی ہیں وہ سب غالب کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔

خالص جذبات نگاری کی مثالیں کلام غالب سے ابتدائی صفحات میں دے چکے ہیں، اب تغزل و شاعری کے دوسرے محاسن کو ملاحظہ فرمایئے جن پر تمام اساتذہ

ایران کی شہرت کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ یہ دوسرے محاسن کیا ہیں۔ "جدّتِ بیان" یا "ابداعِ اسلوب":

"جدّتِ بیان" کے سلسلہ میں سب سے پہلی چیز جو ہمارے ذہن و تصور کو چونکا دیتی ہے وہ "معنی آفرینی" ہے، یعنی بیان بھی نیا اور تخیل بھی نئی، اس کے بعد مرتبہ ہے اُس "جدّتِ بیان" کا جس میں خیال تو نیا نہیں، لیکن "پیرایہ ادائے اس میں ندرت پیدا کی جاتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ زیادہ مشکل ہے.... کیونکہ ہر نئی تخیل اپنے ساتھ نئی زبان بھی لاتی ہے اور نیا انداز بیان بھی خود اسی سے پیدا ہوتا ہے، لیکن کسی پامال مضمون کو کسی ایسے طریقہ سے پیش کرنا کہ اس کی کہنگی دُور ہو جائے اور پڑھنے والوں کو نیا معلوم ہو، نہایت لطیف ذوق، نہایت پاکیزہ فکر اور حد درجہ ذہانت چاہتا ہے اور اسی کے ساتھ زبان کی غیر معمولی مہارت بھی کیونکہ اگر بیان میں سلاست و روانی نہ ہو، تو معنی آفرینی اور جدّتِ بیان دونوں بیکار رہیں اور غالب کے کلام میں یہ تمام باتیں تکمیل کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔

غالب کی معنی آفرینی

اگر غالب کی اور تمام خصوصیات کو نظر انداز کر کے صرف اسی ایک خصوصیت کو سامنے رکھا جائے تو بھی اس کے باکمال غزل گو ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا۔ محض معنی آفرینی یقیناً کوئی درجہ نہیں رکھتی، اگر وہ کسی ذہین مطالعہ کا نتیجہ نہیں ہے، لیکن ایک باکمال شاعر کی معنی آفرینی باوجود نزاکتِ تخیل کے فطری حدود سے آگے بڑھتی ہے اور نہ زبان و بیان کے لحاظ سے بار ساعت ہوتی ہے بلکہ وہ فلسفہ ایسے خشک مباحث میں بھی رنگینی پیدا کر کے غزل کے حدود میں لے آتی ہے۔

عرفی کا مشہور شعر ہے:-

ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در جیحون عشق موج دریا سلسبیل و قعر دریا آتش ست

شعر کا مطلب یہ ہے کہ بہ عشق کے جیحون (ایک نہر یا ندی کا نام ہے) میں یہ برد کر ضرورت ہے کہ انسان سمندر (ایک کیڑا جس کے متعلق مشہور ہے کہ آگ سے پیدا ہوتا ہے اور آگ ہی میں رہتا ہے) بھی بنا رہے اور مچھلی بھی، کیونکہ اس دریا کی موج (یعنی بالائی سطح) سلسبیل (بہشت کے ایک چشمہ کا نام ہے) اور اس کی گہرائی آگ!۔

مدعا یہ کہ اگر کوئی شخص عشق کی ابتدا و انتہا دونوں سے جان سلامت لے آنا چاہتا ہے تو اس کو سمندر اور ماہی دونوں ہونا چاہیئے تاکہ جب سطح پر ہے تیرتا رہے اور جب تہ میں پہونچ جائے تو وہاں کی گرمی سے متاثر نہ ہو۔

بظاہر یہ شعر معنی آفرینی کی اچھی مثال نظر آتا ہے، لیکن ایک نقاد کو اس میں کئی نقص نظر آئیں گے۔ سب سے پہلا نقص تو انتخاب الفاظ کا ہے۔ پہلے مصرع میں شاعر نے جیحون کا لفظ استعمال کیا ہے جو ایک رود بار کا نام ہے اور مجازاً دریا کے مفہوم میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں اسی کو وہ ایک سلسبیل کہتا ہے اور دوسری جگہ دریا، حالانکہ یہ تینوں چیزیں علیحدہ علیحدہ حیثیت رکھتی ہیں۔

دوسرا معنوی نقص یہ ہے کہ مصرعۂ ثانی میں سلسبیل کا لفظ جیحون کے مقابلہ میں تنزل درجہ رکھتا ہے، اگر سلسبیل سے مراد محض چشمہ جاری ہو تو بھی وہ ایسی چیز نہیں جس میں سوا مچھلی کے کوئی اور شناوری نہ کر سکے۔ مصرعۂ ثانی کے دوسرے ٹکڑے میں جو منظر پیش کیا گیا ہے وہ یقیناً سمندر کے لیے موزوں ہے، لیکن پہلے ٹکڑے میں سلسبیل کا لفظ منظر کی کوئی ایسی خصوصیت ظاہر نہیں کرتا جو صرف ماہی کے لیے موزوں ہو۔

سلسبیل کے مفہوم کی روایتی شگفتگی و مسرت اس کی مقتضی نہ تھی کہ اسے کسی

مصیبت کے اظہار کے لیے استعمال کیا جاتا، علاوہ ان نقائص کے خود مفہوم میں بھی کوئی جدّت نہیں ہے ظاہر ہے کہ مچھلی ہمیشہ پانی میں تیرتی ہے اور سمندر آگ میں رہتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ غالب نے انھیں نقائص کو سامنے رکھ کر عرفی کے اس شعر میں یوں تصرف کیا ہے:۔

در بلا بودن بہ از بیم بلا ست قعر دریا سلسبیل و روئے دریا آتش ست

یعنی کسی مصیبت میں پڑ جانا، اس مصیبت کے خوف سے کہیں بہتر ہے۔ اور اس کا ثبوت اس نے دوسرے مصرع میں، یہ دیا ہے کہ جب تک انسان دریا کی سطح پر ڈوبنے سے بچنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا ہے، پریشان رہتا ہے لیکن جب وہ ڈوب کر دریا کی تہ تک پہونچتا ہے تو ساری مصیبت دور ہو جاتی ہے۔ گویا سطح آب اس کے لیے آگ تھی اور قعر دریا سلسبیل بن گیا۔

آپ نے دیکھا کہ غالب نے سلسبیل کا کتنا صحیح استعمال کیا ہے اور معنی آفرینی تو خیر ظاہر ہے۔

غالب کی اس خصوصیت کی چند مثالیں اور ملاحظہ فرمایئے۔

از گداز یک جہاں ہستی صبوحی کردہ ایم آفتاب صبح محشر ساغر سرشار ما

محشر کا منظر بہت جانگداز ہے۔ لیکن غالب کے لیے آفتاب حشر بھی ساغر سرشار کا حکم رکھتا ہے۔ اگر یہ بات اسی جگہ ختم ہو جاتی تو بھی بے مزہ سی رہتی کیونکہ آفتاب کو بھی نے ساغر کہا ہے، لیکن پہلے مصرعہ نے مفہوم کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔ چونکہ آفتاب حشر کے متعلق مشہور ہے کہ وہ سوا نیزہ پر آجائے گا اور لوگوں کا دماغ تک پگھلنے لگے گا، اس لیے اُسے "گداز یک جہاں ہستی" سے تعبیر کرنا ہر شاعر کا کام نہ تھا۔ اب معنوی خوبی دیکھیے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص "گداز یک جہاں ہستی" سے

صبوحی کرے گا، خود اس کے سوز و گداز کی شدت کا کیا عالم ہوگا۔ اس لیے آفتاب محشر کو ساغر سرشار قرار دینے کا ثبوت بھی دے دیا کیونکہ جو شخص اتنا سوز و گداز لے کر آجائے گا وہ یقیناً خوف محشر سے بے نیاز ہوگا

گرفتہ خاطر از اسباب و سرخوشی باقی ست		ترانۂ کہ نہ گنجد بہ سازمی خواہم

یعنی مسرت و شادمانی کے جتنے اسباب ہو سکتے ہیں اُن سب سے دل ہٹ گیا ہے کیونکہ وہ ناکافی ہیں اور ولولۂ نشاط پورا نہیں ہو۔۔۔ یہاں تک تو خیر ایک ایسی بات تھی جس کا احساس ہر ذی انسان کو ہو سکتا ہے، لیکن اس کیفیت کا اظہار اس جدید اسلوب سے کرنا کہ "یہ کیفیت گویا ایک ایسا ترانہ ہے جو ساز میں بھی نہیں سما سکتا" معمولی شاعر کا کام نہ تھا۔

معنی آفرینی اس میں شک نہیں کہ معمولی ذہانت کے انسان کا کام نہیں، لیکن اکثر و بیشتر اس راہ میں شعراء بہک جاتے ہیں اور نزاکت تخیل کا غلو اہمال نویسی کی طرف لے جاتا ہے لیکن غالب کی غزلوں میں آپ کی تخیل ایسی نہ ملے گی جس کا پس منظر عشق و حسن کی دنیا سے علٰحدہ ہو اور اسی لیے اس کی نکتہ آفرینیاں زیادہ تر جدت ادا، حسن تعبیر، ابداع بیان، جوش و سرمستی کی صورت میں نظر آتی ہیں اور ایسے حسن کے ساتھ کہ حد سے زیادہ مبالغہ کی حالت میں بھی، وجدان اس سے پورا لطف اٹھاتا ہے۔

اس کا ایک شعر ہے:-

اے کہ اندریں وادی مژدہ از ہما دادی		بر سرم ز آزادی سایہ را گراں بنہات

تم مجھے اس وادی یعنی اس زندگی میں ہما کے آنے اور میرے سر پر سایہ فگن ہونے کی خوشخبری کیا سناتے ہو، میں تو وہ آزاد انسان ہوں کہ اپنے سر پر سایہ کے بوجھ کو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔

فرط ناتوانی و نزاکت سے سایہ کے بوجھ کو برداشت نہ کر سکنا، ممکن ہے کسی اور نے بھی لکھا ہو، لیکن اس کو آزادی کے منافی کہنا، ایسی غیر معمولی براعت فکر ہے جس کی

مثالیں آپ کو شاذ و نادر ہی کہیں مل سکتی ہیں۔ کسی کے احسان کو گوارا نہ کرسکنے کا خیال اس سے زیادہ خوبصورت، نازک اور موثر انداز میں میری نگاہ سے کہیں نہیں گزرا۔ اسی قسم کی ایک دلکش شاعرانہ تعلّی کی دوسری مثال ملاحظہ ہو۔

شنیدہ کہ بہ آتش نہ سوخت ابراہیم
ببیں کہ بے شرر و شعلہ می توانم سوخت

شاعری کی دنیا میں موسیٰ اور یوسفؑ کا ذکر بہت پایا جاتا ہے، لیکن ابراہیمؑ کے واقعات میں شاعروں کو کوئی بات ایسی نظر نہ آئی تھی کہ انھیں وہ اپنے طنز و طعن کا ہدف بنا سکتے، لیکن غالبؔ نے ایک نکتہ پیدا کر ہی لیا اور وہ بھی اس قدر دل آویز کہ صرف وجدان ہی اس کا پورا لطف اٹھا سکتا ہے۔

اسی زمین کے دو شعر اور سنیے:-

مرا دمیدن گل در گماں فگند امروز
کہ باز بر سر شاخ گل آشیانم سوخت

کھلے ہوئے پھول کو دیکھ کر یہ سمجھنا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ آشیانہ جل رہا ہو، حضرت غالبؔ ہی کے سمجھنے اور کہنے کی بات تھی۔

نوید آمدنت رشک از وفا دارد
شگفتہ روئی گلہائے بوستانم سوخت

غالبؔ صرف یہ کہنا چاہتا ہے کہ پھولوں کی شگفتگی محبوب کے حسن کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی، لیکن اس خیال کے اظہار کے لیے جو پیرایۂ بیان اس نے اختیار کیا ہے وہ "جدّتِ ادا" کی آخری حد ہے۔

خمریاتِ غالبؔ

شراب و متعلقاتِ شراب پر گفتگو اس کا خاص موضوع ہے اور اس سلسلہ میں بڑی لطیف شوخ بیانیوں سے کام لیا گیا ہے، مثلاً:-

پاک خور امروز نہار از پئے فردا منہ
در شریعت بادہ امروز آب و فردا آتش ست

اہلِ شریعت کا بیان ہے کہ دنیا میں جس چیز کو لوگ شراب کہہ کر پیتے ہیں وہی

کل (قیامت کے دن) آگ بن جائے گی، غالب کہتا ہے کہ اگر یہ صحیح ہے تو کیوں نہ ہم آج اتنی پئیں کہ کل کے لیے باقی ہی نہ رہے۔ نہ باقی رہے گی نہ آگ بنے گی۔

راہے زکنج دیر بہ مینو کشادہ ایم　　　　از خم کشم پیالہ و در کوثر افگنم

ہم خراباتوں کو تم گنہگار، دوزخی نہ سمجھو، خرابات سے بہشت جانے کی بھی ایک راہ ہم نے پیدا کرلی ہے۔ اس لیے ہمارا شراب پینا گویا خم سے شراب لے لے کر کوثر میں اس کا ذخیرہ جمع کرنا ہے تاکہ مرنے کے بعد اس سے لطف اٹھائیں۔

غالب کا مقصود صرف یہ کہنا ہے کہ اگر جام کوثر "جام شراب" نہیں تو بیکار ہے، لیکن اس کے لیے پیرایۂ بیان کتنا اچھوتا اختیار کیا ہے۔

زاہد از ما خوشۂ تاکے بہ چشم کم مبیں　　　　ہے نمیدانی کہ یک پیمانہ نقصاں کردہ ایم

زاہد سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اگر میں نے تم کو انگور کا خوشہ تحفہ میں دیدیا تو اسے کم نہ سمجھو، کیونکہ اس طرح میں نے تمہارے لیے گویا پورے ایک جام شراب کا نقصان گوارا کرلیا اور یہ کوئی معمولی بات نہیں۔

شراب کے سلسلہ میں شوخی بیان کی چند اور مثالیں ملاحظہ ہوں۔

خجلت نگر کہ در حسناتم نیافتند　　　　جز روزۂ درست زصہبا کشودۂ

قیامت کے دن میری شرمندگی کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ سوا اس ایک روزہ کے جو میں نے شراب سے کھولا تھا اور کوئی اچھا کام میرے اعمالنامہ میں نظر ہی نہ آیا۔

شوخی بیان تو خیر ظاہر ہے، لیکن اسی کے ساتھ درپردہ یہ بھی ظاہر کردیا کہ مجھے دنیا میں کتنی کم شراب میسر آئی۔!

"خمریات" کی شاعری میں میخواری کی شدت ظاہر کرنے کے لیے شاعروں نے تو

اکثر یہ کہا ہے کہ:۔

ما دُردی کشِ میخانہ ایم

یعنی ہم شراب کی تلچھٹ تک پی جاتے ہیں، لیکن غالب کی بدمست رندی کا عالم ہی کچھ اور ہے، وہ کہتا ہے کہ:۔

تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

خمریات کے سلسلہ میں شوخ بیانی کی ایسی مثالیں کلام غالب میں بہت مل سکتی ہیں، لیکن ان سے بہتر غالب کے وہ اشعار ہیں جن میں بجائے شوخی کے صرف کیفیت کا اظہار کیا گیا ہے، جن میں مستی و بیخودی کا ذکر مستی و بیخودی کے عالم میں کیا گیا ہے۔ مثلاً:۔

مستم زخونِ دل کہ دو چشمم ازاں پُر است گوئی مخور شراب و ندانی بہ جام چیست

جنوں مستم بہ فصل نوبہارم می تواں کشتن صراحی برکف و گل در کنارم می تواں کشتن

شیوۂ رندانِ بے پروا خرام از من مپرس اینقدر دانم کہ دشوار است آساں زیستن

چو بوئے گل جنوں تازیم از مستی چہ می پرسی گسستن دارد از صد جا عنانِ اختیار ما

بوسہ از لبانم دہ، عمر خضر از من مخواہ جام بے بیشم بنہ، عشرت جم از من مپرس

بادہ مشکبوئے ما، بید کنار کشت ما کوثر و سلسبیل ما طوبیٔ ما بہشت ما

کہتے ہیں کہ ہم سے شراب پلانے کا وعدہ حشر میں کیا گیا ہے اور ممکن ہے وعدہ کرنے والا شاید یہ سوچتا ہے کہ یہ وعدہ ہم کو بہت ہی گراں گزرے گا۔ اور ہم اس طول مدت سے گھبرا جائیں گے۔ مگر ہم کو اس سے زیادہ خوشی ہے اس لیے کہ شراب جتنی پرانی ہوتی جاتی ہے۔ وہ اور بھی لطیف ہوتی جاتی ہے۔

گفتی زمے بحشر دہم رنجم ازیں درنگ مستی دہد زیادہ چو صہبا کہن شود

ایک جگہ کہتے ہیں کہ عید کا دن ہے خوشحالی اور سرور خرمی کا دور دورہ ہے۔

پی اور خوب جی بھر کے پی۔ اگر یہ گناہ ہے تو میں اس کا ذمہ دار ہوں۔

عید است و نشاط و طرب و زمزمہ عام است   مے نوش گنہ بر من اگر بادہ حرام است

اسی سلسلہ میں کہتے ہیں کہ شراب بھی کیا کوئی روزہ ہے جو آج کے دن حرام ہے۔

عید است و صلائے خورد و نوش است جہاں را   مے روزہ نباشد کہ دریں روزہ حرام است

ساقی سے کہتے ہیں کہ یہ تو تجھ کو معلوم ہی ہے کہ شراب اندازہ سے پینا حرام ہے۔ بے اندازہ حلال ہے اس کی ترکیب یہ ہے کہ تو اٹھ کر اپنا شیشہ ہمارے پیمانہ پر ٹپک دے۔

مے باندازہ حرام آمدہ ساقی ورنہ   شیشۂ خود بہ شکن بر سر پیمانۂ ما

ایک جگہ کہتے ہیں کہ عشق ہو تب اُس کو آج ہی چڑھا جاؤ، اور یاد رکھو کہ شریعت ہم کو یہی خبر دیتی ہے کہ شراب آج پانی ہے کل یہ آگ ہو جائے گی۔

پاک خور امروز در بہار از پئے فردا منہ   در شریعت بادہ امروز آب و فردا آتش است

ایک جگہ کہتے ہیں کہ اس جنگ و جدل کو چھوڑ کر کہاں فضول جھگڑوں میں پڑا ہے۔ میخانہ کی باتیں کر کیوں کہ نہ جنگ جدل کی باتیں ہوتی ہیں اور نہ کوئی فدک کا جھگڑا لے کر بیٹھتا ہے۔

بحث و جدل بجائے ماں میکدہ جوئے کاندراں   کس نفس از جمل نزد کس سخن از فدک نخواست

ایک جگہ کہتے ہیں کہ شراب پی اور خدا کے کرم پر بھروسہ رکھ کیونکہ خط پیالہ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کتنی پینی چاہیئے۔ کب پینی چاہیئے کیوں کر پینی چاہیئے مطلب صرف پینے سے ہے پیئے جاؤ۔

مے نوش و تکیہ بر کرم کردگار کن   خط پیالہ را رقم چون و چند نیست

ایک جگہ کہتے ہیں کہ غالب میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ برسات صرف ان تین باتوں کے لیے آتی ہے اور اس موسم کے پیدا کرنے کا کوئی مقصد ہی نہیں ہے۔ شراب چڑھائے

آم کھلائے اور برف کا پانی پئے:۔

غالب من و خدا کہ سرانجام برشگال
غیر از شراب و انبۂ و برفاب و قند نیست

ایک جگہ کہتے ہیں کہ ابر کرم کا مشغلہ بس اتنا ہی ہے کہ جن لوگوں کے خرقے پر شراب کے داغ ہوں انھیں دھویا کرے:۔

شست و شو شغلۂ شوخی ابر کرم است
ز رم آں خرقہ کہ بادا غ نیا سودن رفت

معشوق کو ہدایت کرتے ہیں کہ روزہ کے مہینے میں زلفیں کھولے ہوئے تو پریشان ہو کر کیوں پھر رہا ہے۔ روزہ کر شراب پی۔ کہ آج زمانہ میں تیری زلفیں پریشان ہونے کی وجہ سے یا تیرا چاند سا چہرہ دیکھنے سے عید کی چاند رات ہو رہی ہے۔

در ماہ روزہ طرہ پریشاں چرمی روی
مے خور کہ در زمانہ شب عید بودہ است

ایک جگہ کہتے ہیں کہ بھئی اب ہم میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اتنی دور ہو جائیں اور شراب کا گھڑا لے کر واپس آئیں۔ ہمارا مکان تو بس میخانہ کے قریب ہی بننا چاہیے تھا۔

بر نتابم سبو بادہ زدور آوردن
خانۂ من بسر کوئے مغاں بایستے

ایک جگہ یوں منادی کرتے ہیں کہ بھائیو ولایتی شراب آگئی ہے اور بہت سستی ہو گئی ہے۔ اور دین کے عوض ایک گھونٹ ملتی ہے۔ خریدو، دوڑو، دیکھو بہت سستی ہے شاید پھر نہ ملے:۔

از فرنگ آمدہ در شہر فراواں شدہ است
جرعہ را دین عوض آرید مے ارزاں شدہ است

آپ کعبہ میں ہیں اور نعرے لگا رہے ہیں، کہ ہے کوئی خدا کا ایسا نیک بندہ جو کعبہ میں ہمیں شراب کا ایک پیالہ پلائے۔ ضمانت کے لیے اگر ضرورت ہو تو ہم جامۂ احرام گرو رکھ سکتے ہیں:۔

کیست در کعبہ کہ رطلے ز نبیذم بخشد
در گرو گاں طلبد در جامۂ احرامی ہست

ایک جگہ کہتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے، کہ بغدادی کون ہے اور بسطامی کون ہے۔ ہم

تو یہ جانتے ہیں کہ معشوق تاتار سے آتے ہیں اور شراب لندن سے :-

مے صافی ز فرنگ آید و شاہد ز تتار ماندانیم کہ بغدادی و بسطامی ہست

ایک جگہ کہتے ہیں کہ خلوت میں جو روزانہ دوست کے ساتھ شراب پیتا رہتا ہے وہ اچھی طرح حور اور کوثر بہشت کی حقیقت کو جانتا ہے :-

با دوست ہر کہ بادہ بخلوت خورد مدام داند کہ حور و کوثر و دار السلام چیست

اسی غزل میں کہتے ہیں، آج کل میاں غالب شراب کا نرخ دریافت کرتے پھرتے ہیں معلوم ہوتا ہے، مصحف اور خرقہ کہیں بک گیا ہے :-

از کار ما کرام نصیب است خاک را تا از فلک نصیبۂ کاس کرام چیست

غالب اگر نہ خرقہ و مصحف بہم فروخت پرسد چرا کہ نرخ مے لالہ فام چیست

کہتے ہیں کہ غالب جو بہشت میں گیا داروغہ بہشت نے شیر و شہد سے تواضع کی، اس غریب نے کہا معاف فرمائیے ہمیں تو شراب چاہیے -

رضواں چو شہد و شیر بہ غالب حوالہ کرد بیچارہ باز داد و مے مشکبو گرفت

کہتے ہیں شراب سب کو ایک ہی سبو سے ملتی ہے - مگر قسمیں سب کی الگ ہیں، جمشید جام جم میں پیتا ہے - اور قلندر اپنی تونبی میں -

از یک سبو است بادہ و قسمت جدا جدا است جمشید جام بُرد و قلندر کدو گرفت

ایک جگہ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی بہار برسات ہے - خیر خدا کا شکر ہے یہاں بھی شراب پینے کا ایک موسم ہے :-

بہار ہند بود برشگال ہاں غالب دریں خزاں کدہ ہم موسم شرابے ہست

کہتے ہیں کہ شراب سے جو منع کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی - فتنہ انگیز - اور یہ فقرہ ضرب المثل کے طور پر اس میں آیا ہے اس قدر بلیغ ہے کہ سیکڑوں ظرافت آمیز معنی اس میں پیدا ہو سکتے ہیں :-

باید ز مے ہر آئینہ پرہیز گفتہ اند آرے دروغ مصلحت آمیز گفتہ اند

کہتے ہیں کہ نہ معلوم مجھے لوگ شراب پینے سے کیوں روکتے ہیں۔ میں کوئی محدث اور فقیہ تو ہوں نہیں کہ میری ثقاہت کو شراب نقصان پہونچائے گی۔ میں تو شاعر ہوں، شاعر کو شراب سے کیا نقصان پہونچ سکتا ہے۔

بیادہ گر بود سیل، شاعرم نہ فقیہ سخن چہ ننگ ز آلودہ دامنی دارد

اسی غزل میں کہتے ہیں کہ ہم میکدے میں آئے ہیں تو ساقی کھچا جاتا ہے۔ ہم اپنے جی میں خوش ہیں، کہ ہماری بڑی تعظیم ہو رہی ہے اور یہ واقعہ ہے کہ شراب رہی نہیں ہے ساقی صرف اس بزرگ داشت پر ہم کو ٹالنا چاہتا ہے۔

خوشم ببزم ز اکرام خویش و زیں غافل کہ مے نماندہ و ساقی فروتنی دارد

کہتے ہیں کہ یہ بے مغز واعظ سمجھے ہیں کہ جنت میں حوریں ہیں، کوثر ہے کیونکہ اس کی خبر دی گئی ہے، اور احمق یہ نہیں سمجھتے ہیں کہ حور و کوثر فقط ایک استعارہ ہے شراب و شاہد کا کھلم کھلا نام لینا منع ہے۔ ان کو صرف یہ نام لے کر کام میں پھنسا دیا ہے ورنہ مطلب وہی شراب و شاہد ہے۔

گفتند حور و کوثر دادہ ند ذوق کار منع است نام شاہد و مے آشکار بود

کہتے ہیں کہ میں تو توبہ کر کے مسجد میں آ گیا تھا، اپنے ذوق عبادت میں مصروف تھا، ساقی آیا اور آ کر مجھ سے کہا کہ کیا تسبیح لے کے بیٹھا ہے۔ آجکل شراب خانہ میں طرح طرح کی شرابیں آئی ہیں۔ بس یہ سن کے میرے منھ میں پانی بھر آیا اور تسبیح و مصلےٰ چھوڑ کر پھر میخانہ میں آ گیا۔ اب جو یہاں آ کے دیکھا تو یہ سب فریب تھا۔ یہاں ایک دو ساغر سے زیادہ موجود نہیں ہے۔

ساقی دگرم برد بمے خانہ ز مسجد مے یک دو قدح بود و فریبم بہ سبو داد

واعظ سے کہتے ہیں کہ ہمیں تو صرف شراب کا ایک مٹکا بھر کے بھیجدے باقی پھر تو جا ہے

جتنے دودھ کے دریا بہائے جا ہیں اور پرہیزگاروں کو زیب دئے جا۔

خمے از مے بہ ما لفرست دانگہ ہر قدر خواہی — رواں کن جوئے از شیر و دل زیر پرہیزگاراں بر

کہتے ہیں کہ روزہ داروں کے اوپر بڑا رحم آتا ہے عید کے دن بھی غریب شیر و خرما میں مست ہیں بھلا اس شیر و خرما میں شراب کا لطف کہاں۔ بھئی خدا کے لیے کوئی پیالہ کہ ہمارے نشاط میں سے تھوڑا سا حصہ پہونچا دو۔

ندارد شیر و خرما ذوق صہبا رحم مے آید — نشاط عید از ما ہدیہ سوئے روزہ داراں بر

کہتے ہیں کہ کیا کہنا ہے کوثر اور کوثر کی شراب مقدس کا۔ مگر ہمارے خمار میں وہ کام نہیں آسکتی۔

خوش است کوثر و پاکست بادہ کہ در دست — ازاں رحیق مقدس دریں خمار چہ حظ

کہتے ہیں کہ سنو بھئی غالب خیر یہ تو منظور ہے کہ ہم تم کو میخانہ کے پاس ہی کہیں رہنے کے لیے جگہ دے دیتے ہیں مگر شرط صرف یہ ہے کہ صرف سونگھنے پر قناعت کیجیے پینے کو نہیں ملے گی۔

ترا بہ پہلوئے میخانہ جا دہیم غالب — بشرط آنکہ قناعت کنی ببوئے رحیق

کہتے ہیں کہ دوزخ اور کوثر میرے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہے، ایک زمانہ تھا کہ میرے سینے میں بھی ایسی ہی آگ لگی تھی، اور میرے ساغر میں بھی ایسا ہی پانی تھا۔

تا چہ سنجم دوزخ و کوثر کہ من نیز ایں چنیں — آتشے در سینۂ و آبے بہ کوثر داشتم

کہتے ہیں کہ ہم ذمی ہیں۔ یعنی وہ کافر ہیں کہ جنھیں بادشاہ نے پناہ دی ہے، بڑی خوشی کی بات ہے اب اگر رمضان کے مہینہ میں بازار میں بیٹھ کر پئیں تو بھی ہمارا کچھ نہیں کر سکتا۔

من کافر نہاری شاہم بہ من ازو — مے در رمضان بر سر بازار کشیدن

کہتے ہیں کہ جنت مل بھی گئی تو کیا لطف اور وہاں شراب بھی ملی تو کیا نتیجہ۔ نہ تو

بادہ طہور میں محتسب کا غم اور نہ اس عیش میں اندیشۂ زوال۔ پھر وہ شراب کس کام کی۔ اور اس عیش کا کیا مزا:۔

در بادہ طہور غم محتسب کجا   در عیش خلد لذت بیم زوال کو

کہتے ہیں کہ حشر میں میری حسنات کا جائزہ لیا گیا تو سوائے ایسے روزوں کے جو شراب سے کھولے گئے تھے، ایک نیکی بھی نہ ملی:۔

خجلت نگر کہ در حسناتم نیافتند   جز روزۂ درست ز صہبا کشودہ

ایک جگہ کہتے ہیں کہ غالب چاندنی رات ہے، شراب پیو، مانا کہ رمضان ہے لیکن شب ماہ بھی تو ہے اور لطف بادہ نوشی چاندنی ہی میں ہے:۔

غالب سر خم بکشا پیمانہ بہ مے در زن   آخر نہ شب ماہست گیرم رمضانستے

غالب کی شوخ نگاری

غالب کی وہ خصوصیت جس میں اس کا کوئی ہمسر نہ ایران نے پیدا کیا نہ ہندوستان نے، اس کی شوخ نگاری ہے۔ شوخ نگاری عہد مغلیہ کے تمام شعراء کی خصوصیت تھی اور ایسا ہونا چاہیے تھا، کیونکہ اس وقت ہر شاعر اپنے تفوق کے لیے انتہائی جد و جہد میں مصروف تھا اور اس سلسلہ میں ایک دوسرے پر طعن ضروری تھا۔ اس ضرورت نے لٹریچر میں "طنزیات" کے نئے باب کا اضافہ کر دیا اور رفتہ رفتہ قطعات و قصاید کے علاوہ غزلوں میں بھی اس کا رواج ہو گیا، لیکن ذرا ہلکا اور اسی کا نام شوخ نگاری ہے۔

غزلوں میں شوخ نگاری کا ہدف زیادہ تر شیخ و زاہد کو قرار دیا جاتا ہے، لیکن یہ انداز بیان وسیع ہو کر بہت سے معاملات حسن و عشق پر حاوی ہو گیا اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ غالب کی شوخ نگاری میں جتنی جدت و دلکشی پائی جاتی ہے وہ مشکل ہی سے کہیں اور نظر آ سکتی ہے۔ بعض اشعار ملاحظہ ہوں:۔

خاموشی انگشت بد آموز تبہاں را   زیں بیش و گرنہ اثرے بود فغاں را

بر طاعتیان فرخ و بر عشرتیان سہل نازم شب آدینہ و ماہِ رمضان را

بے گناہم بپیرِ دیر، از من مرنج من بہ پیمستی شکستہ ام احرام را

جنت چہ کند چارۂ افسردگیِ دل تعمیر باندازۂ ویرانیِ ما نیست

رواں فدائے تو نامم کہ بردۂ نام سیح زہے لطافتِ ذوقے کہ در بیانِ تو نیست

مے بہ زاہد مکن عرض کہ ایں جوہرِ ناب پیشِ ایں قوم بہ شوربۂ زمزم نرسد

سنگ و خشت از مسجد ویرانہ می آرم بشہر خانۂ در کوئے ترسایاں عمارت می کنم

زمن حذر نہ کنی گر لباس دیں دارم نہفتہ کافرم و بت در آستیں دارم

مرزا کی شوخ نگاری کی بعض اور پاکیزہ مثالیں ملاحظہ ہوں:-

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار ساقی و مغنی و شرابے و سرودے

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند حق را بہ سجودے و نبی را بہ درودے

لا تقربوا الصلوٰۃ، زنہیم بہ خاطر ست وزامر یاد ما نمرہ کلوا واشربوا مرا

حال من از غمِ بی پری وحشت می بریم آگہی بارے کہ آگہ نیستی از حالِ ما

اس میں لفظ آگہ کی تکرار نے بڑی لطیف شوخی پیدا کردی ہے۔

زانگستی و با دیگراں گر دبستی بیا کہ عہدِ وفا نیست استوار بیا

جب تم یقیں کہتے ہو کہ عہدِ وفا کا کیا اعتبار، تو پھر کیا پس و پیش ہے، اغیار سے عہد وفا توڑ کر پھر میرے پاس آجاؤ۔

گزیں از جور بہ انصاف گراید چہ عجب از حیا روے بما گر نہ نماید چہ عجب

حالانکہ جور سے شرما کر منہ چھپا لینا خود بڑا جور ہے اور غالباً اسی لیے وہ تلافی ستم پر آمادہ ہوا ہے کہ یہ مجھ پر اور زیادہ جور ہوگا۔

یاد از عدو نہ دارم دانیم ز دور بینی ست کاندر گزشتن، با دوست ہمنشینی ست

اگر میں عدو کا خیال بھی دل میں نہیں لاتا تو اس کا سبب یہ ہے کہ مبادا اُسے

دوست کی ہمنشینی حاصل ہوجائے کیونکہ دل میں تو دوست کے سوا کچھ نہیں۔

من سوئے او بہ بینم و اندازِ بے حیائی ست — او سوئے من نہ بیند دانم کہ شرمگینی ست

کس قدر عجیب بات ہے کہ میں تمھیں دیکھوں تو بے حیائی ہے اور تم مجھے نہ دیکھو تو ادائے شرم ہے۔

پاک خور امروز زنہار از پئے فردا منہ — در شریعت بادہ امروز آب فردا آتش است

شریعت بتاتی ہے کہ آج جو چیز شراب ہے کل وہی دوزخ کی آگ ہوجائے گی اس لیے مناسب یہی ہے کہ اسے آج ہی یہاں ختم کر دی جائے تاکہ وہ آگ نہ بن سکے۔

کار عجب افتاد بدیں شیفتہ ما را — مومن نبود غالب و کافر نتواں گفت
در قالبِ ملا اثرش پردہ کشا شد — خاکے کہ قضا در تنِ گوسالہ فرو ریخت

یعنی ملا کا حال بالکل گوسالۂ سامری کا سا ہے کہ اس میں خاک پائے جبرئیل ڈال دی گئی تھی اور وہ بولنے لگا تھا۔ مدعا یہ کہ ملا خود اپنی عقل کچھ نہیں رکھتا۔

نیکی ز تست از تو نخواہیم مزد کار — ور خود بدیم کار تو ایم انتقام چیست

خدا پر طعن ہے کہ جب نیکی بھی تیری ہی طرف سے ہے اور ہم اس کا انعام طلب نہیں تو پھر بدی کا انتقام کیسا جبکہ وہ بھی تیری ہی طرف سے ہے۔

رضواں چو شہد و شیر بغالب حوالہ کرد — بیچارہ باز داد و مئے مشکبو گرفت

یہ طنز ہے فردوس کی لذائذ پر کہ وہاں کے شہد و شیر سے شراب بدرجہا بہتر ہے

شباب و زہد چہ ناقدردانی ہستی ست — بلا بجان جوانانِ پارسا ریزد

یعنی عالم شباب کی پارسائی، زندگی کی توہین ہے۔

مے بزہاد مکن عرض کہ ایں جوہر ناب — پیش ایں قوم بہ شورابۂ زمزم نرسد
خواجہ فردوس بہ میراث تمنا دارد — وائے گر در روش نسل بہ آدم نرسد

زاہد فردوس کا مدعی ہے اس بنا پر کہ وہ اولاد آدم میں سے ہے، بڑا مزہ

ہو اگر اس کا شجرۂ نسب آدم تک نہ پہونچے۔

باید زمے ہر آئینہ پرہیز گفتہ اند　　　آرے دروغ مصلحت آمیز گفتہ اند

زاہد از حور بہشتی بجز ایں نشناسد　　　کہ شود دست زد شوق و بکارش نہ رود

زانچہ دل زہم پاشد دل چہ طرف بر بندد　　　یا مجال گفتن دہ یا نہ گفتہ یاد کن

ایسی چیز جو دل کے ٹکڑے اڑائے دیتی ہے۔ بھلا دل اُس کا کیا مقابلہ کرسکتا ہے۔ لہٰذا یا تو آپ اُس کے کہنے کی مجھے اجازت دیدیجئے یا بغیر کہے یقین کرلیجئے۔

بخون من اگر ننگست دست و خنجر آلودن　　　نوید وعدۂ کن انتظارم میتواں کشتن

اگر میرے خون میں دست و خنجر کو آلودہ کرنا باعث ننگ ہے تو اس سے زیادہ آسان ترکیب یہ ہے کہ وعدہ کرلیجئے انتظار کرتے کرتے آپ مرجاؤں گا۔

طاق شد طاقت ز غنجت برگراں خواہم شدن　　　مہرباں شو ورنہ بر خود مہرباں خواہم شدن

مجھ میں اب آپ کے ناز اٹھانے کی تاب و طاقت نہیں ہے، اس لیے یا تو مجھ پر آپ مہربان ہوجائیے۔ ورنہ خود اپنے اوپر مہربان ہوجاؤں گا اور آپ سے کنارہ کشی اختیار کرلوں گا۔

جاں داد بہ غم غالب خوشنودی روحش را　　　در بزم عزا مے کش در نوحہ غزلخواں شو

غالب کا انتقال ہوگیا۔ اب ان کی روح پر فتوح کو یوں ثواب پہونچائیے کہ مجلس عزا میں بیٹھ کر شراب پیجئے اور نوحہ میں غزلخوانی کیجئے۔

سرمایہ کرامت کن وانگاہ بہ غارت بر　　　بر خرمن ما برقے بر مزرعہ باراں شو

اگر لوٹنے کا ارادہ ہے تو پہلے سرمایہ عنایت فرمائیے۔ خرمن پر آپ برق بنے ہیں تو کھیت پر باران رحمت بنئے۔

نازم بدو کافر چہ دستگاہ آخر　　　سبحۂ و سواکے قشقہ و زنارے

فرماتے ہیں کہ یہ مومن اور کافر آخر کس چیز پر اتراتے اور اینڈتے پھرتے ہیں انکے پاس

رکھا گیا ہے۔ مومن کے پاس صرف تسبیح و مسواک ہے اور کافر کے پاس فقط قشقہ و زنار۔

سلسلہ دیوار و در از دود دلم گشت سیاہ کلبۂ من بہ سیہ خانۂ لیلےٰ ماند

اپنے گھر پر پھبتی کہتے ہیں کہ میرے دود آہ سے سیاہ ہو کر خیمہ لیلےٰ بن گیا ہے۔

خارج از ہنگامہ سرتا سر بہ بیکاری گزشتہ رشتۂ عمر خضر تہ حلبے بیش نیست

فرماتے ہیں کہ خضر کا رشتہ عمر، تہ حساب[1] ہے وجہ یہ ہے کہ ہنگامے سے علحدہ مزے سے بیکاری کی زندگی گزار رہے ہیں۔

موئے کہ بروں نامدہ باشد چہ عنایم بیہودہ در اندام تو جستیم میاں را

معشوق کی کمر کو ایک ایسا بال بتایا ہے جو ابھی تک پیدا نہیں ہوا۔

رنگہاں چوں شد فراہم صرفے دیگر نداشت خلد را نقش و نگار طاق نسیاں کردہ ایم

بہشت کو کہتے ہیں کہ اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ بہت سے رنگ فراہم ہو گئے تھے اور مصرف کوئی تھا نہیں لہذا ہم نے اُس کو اپنے طاق نسیاں کی زیب و زینت بنا دیا ہے۔

واعظ سفید پوش کی ایک تشبیہ ملاحظہ فرمائیے جو سنگ رخام کی لوح مزار سے دی گئی ہے فرماتے ہیں:-

گر واعظ دل مردہ سفید است ردائیش خود لوح مزارے است کہ از سنگ رخام است

عید کا منظر دکھاتے ہوئے بتاتے ہیں کہ آج زاہد بھی حجرے سے نکل آیا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی جانور پنجرے سے باہر آ گیا ہے۔

زاہد بہ نشاطے زدہ از حجرہ بدر گام کز کنج قفس مرغ گرفتار بر آمد

---

[1] یعنی وہ لکیر جو اعداد و رقم پر کھینچ دی جاتی ہے اور کوئی معنی نہیں رکھتی۔

ایک جگہ کہتے ہیں کہ ہم بڑی مصیبت میں ہیں ہماری تمنا اور خواہش بہشت سے آگے بڑھ گئی ہے یعنی جنت ہماری نگاہ میں کچھ بھی نہیں ہے اور اُدھر حالت یہ ہے کہ جنت سے بڑھ کر کوئی جگہ پیدا نہیں ہوئی۔

یا تمنائے من از خلد بریں نگزشتے یا خود امید گہے در خور آں پیدا نیست

ایک جگہ تمنا کرتے ہیں کاش آسمان پھٹ پڑے خواہ وہ ہمارا ہی سر کیوں نہ ہو۔

خوشا کہ گنبد چرخ کہن فرو ریزد اگر چہ خود ہمہ بر فرق من فرو ریزد

ایک جگہ کہتے ہیں کہ سیکڑوں باتیں ایسی ہیں جو میں اُس سے کہنا چاہتا ہوں۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ وہ نازک مزاج ہے کاہے کو سنے گا کوئی ایسی ترکیب ہونا چاہیے کہ سب تمنائیں کسی ایک تمنا میں تبدیل ہو جائیں اور اس کی ترکیب یہ ہے کہ اس کے لب پر لب رکھ کر مر جانا چاہیے۔

لب برلب دلبر ہم و جاں بہ سپارم ترکیب یکے کردن صد ملتمس است ایں

غالب میدان قیامت میں ہیں، اور تمام عمر کے گناہ معاف کر دیے گئے ہیں۔ آپ گناہ بخشنے والے سے کہتے ہیں کہ ذرا میری بے مائگی پر رحم فرمائیے کہ آپ دستِ کرم نے عمر بھر کے گناہوں کو ایک اشارہ میں برباد کر دیا۔ میں بھی کس قدر تنگ مایہ اور کم حیثیت آدمی نکلا:

بر تنگ مائگیم رحم کہ یک عمر گناہ ہم بتاراج سبکدستی بخشودن رفت

کسی شاعر سے کہتے ہیں کہ اگر آپ کی غزل میری غزل سے زیادہ سر سبز ہوتی ہے اور اُس پر چیخ پکار زیادہ ہوتی ہے تو تعجب کیا ہے۔ چنگ سے ہمیشہ ڈھول کی آواز ہوتی ہے۔ حالانکہ چنگ چنگ ہے اور ڈھول ڈھول۔

اے کہ در بزم شہنشاہ سخن رس گفتہ کے بہ پر گوئی فلاں در شعر ہم سنگ من است

راست گفتی لیک پیدائی کہ بنود جائے طعن کمتر از بانگ دہل گر نغمۂ چنگ من است

ایک جگہ کہتے ہیں کہ بڑے بیوقوف ہیں وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں حسینوں میں وفا نہیں ہوتی۔ ہمارا تجربہ ہے کہ ہمارے معشوق نے جب سے جفا کرنا شروع کی ہے آج تک برابر جفا کرتا چلا جاتا ہے۔ عمر گزر گئی اور اس نے اپنی وضع کو نہیں چھوڑا:۔

عمرے بسر گذشت و ہماں بر سر جور است گویند بتاں را کہ وفا نیست چرا نیست

ایک جگہ کہتے ہیں کہ اچھا صاحب اگر میں التفات کے قابل نہیں ہوں تو نہ سہی آرزو اور تمنا تو کرنے دیجیے، ایک مفلس آدمی کی خوشی کیمیا سازی پر مبنی ہوتی ہے ہمیشہ اسی فکر میں رہتا ہے کہ سونا بنائیں۔ مگر عمر بھر میں ایک دفعہ بھی نہیں بنا سکتا۔ ایسے ہی میری آرزوئیں ہیں:۔

بہ التفات نیرزم در آرزو چہ نزاع نشاط خاطر مفلس نہ کیمیا طلبی است

ایک جگہ کہتے ہیں کہ چاہتا تو میرا محبوب بھی یہی ہے کہ میں مر جاؤں۔ مگر وہ اپنی زبان سے نہیں کہتا کہ ایسا نہ ہو یہ سن کے میں خوشی سے جان دیدوں۔ کیونکہ اس کو میرا مرنا گوارا ہے مگر خوشی سے مرنا گوارا نہیں۔

ز بیم آنکہ مباد ابمیرم از شادی نگوید ار چہ بمرگ من آرزو مند است

ایک جگہ کہتے ہیں کہ ہم کو اس بات کا بالکل اطمینان ہے کہ جہنم کو ہمارے جلانے کی نوبت ہی نہ آئے گی۔ غم ہم کو روز گھلاتا جا رہا ہے لہذا آخر عمر تک ہم ختم ہو جائیں گے اور جہنم تک جانے کا قصہ ہی نہ رہیگا۔

نیست دقتی کہ بما کاہشے از غم نرسد نوبت سوختن ما بہ جہنم نرسد

ایک جگہ معشوق سے کہتے ہیں کہ کیا تم اس بات سے ڈرتے ہو کہ میں حشر کے دن داور حشر کے سامنے شکایت کرنے بیٹھوں گا۔ تمہارا یہ خیال غلط ہے کیونکہ ہجوم نالہ کی

وجہ سے ایک نالہ بھی میرے لب سے نہ نکل سکے گا۔

زمن مترس کہ ناگہ بہ پیش داورِ حشر ہجوم نالہ لبم رازِ نالہ وا دارد

ایک جگہ زاہد یا اپنے کسی دوسرے ہمنشیں سے کہتے ہیں کہ بھائی صاحب شیطان سے آپ ڈریئے۔ آپ کے پاس دین و ایمان ہے۔ ہمارے پاس نہ دین ہے نہ ایمان، ہمیں خوف و فکر کی کیا ضرورت ہے۔

تو داری دین و ایمانے بترس از دیو دنیرنگش چو نبود توشہ راہے چہ باک از رہزنم باشد

ایک جگہ ناصح سے کہتے ہیں کہ بابا کیوں تو میرے سر ہو گیا ہے۔ میں کافر ہوں تو کیوں برا سمجھتا ہے۔ ذرا ابراہیم کو دیکھ انھوں نے بھی تو دین آذری کو ٹھکرا کر ملت ابراہیمی جاری کردی تھی۔ بات یہ ہے کہ جو اہل نظر ہیں وہ پرانی لکیر کے فقیر نہیں رہتے ہیں۔

بامن میاویز اے پدر فرزند آذر را نگر ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد

آپ کے ایک دوست مرزا الف بیگ کی پیرانہ سالی میں لڑکا پیدا ہوا۔ انھوں نے ہمزہ بیگ اس کا نام رکھا۔ مرزا نے مبارکباد کا یہ قطعہ کہہ کر بھیجا جس میں بڑی ظرافت سے کام لیا ہے۔ عربی میں الف کو بھی ہمزہ ہی کہتے ہیں۔ اسی کو مدنظر رکھ کر مرزا کہتے ہیں کہ الف بیگ کے لڑکے کا نام ہمزہ بیگ کیوں نہ ہوتا۔ الف جب منحنی ہوتا ہے تو ہمزہ کہلاتا ہے۔ الف کا منحنی ہونا الف بیگ کے بڑھاپے کی اولاد پر بہترین روشنی ڈال رہا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ ظاہر کرتا ہے کہ باپ کے خصوصیات بیٹے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

چوں الف بیگ در کہن سالے پسرے یافت سر بسر غمزہ
نام او ہمزہ بیگ کرد بلے الف منحنی بود ہمزہ

کسی سے کوئی سوال کرنا، کچھ مانگنا۔ اپنی حاجت کا اظہار کرنا عیب ہے۔ مگر نہ

اس طرح جیسے کہ مرزا کوئی سوال کرتے ہیں۔ مگر مرزا یوں سوال کر رہے ہیں کہ ساقی تجھے معلوم ہے میں پشنگ اور افراسیاب کی اولاد سے ہوں اور اس طریقہ سے تو نے سمجھ ہی لیا ہوگا کہ میں جمشید کی اولاد میں ہوں۔ لہٰذا مجھے میراث جمشید ملنا چاہئے شراب جو جم کی طرف سے وراثتاً مجھ کو پہونچتا ہے وہ اب دیدے۔ اس کے بعد بہشت تو ل ہی جائے گی، کیونکہ میں آدم کی اولاد ہوں اور بہشت آدم کی میراث ہے۔

ساقی چو من پشنگی و افراسیابیم دانی کہ اصل گوہرم از دودۂ جم است
میراث جم کہ میبود اکنوں بمن سپار زاں پس رسد بہشت کہ میراث آدم است

نواب یوسف علی خاں مرحوم سابق والی رامپور کو جب گورنمنٹ انگلشیہ کی طرف سے ریاست عطا ہوئی تو مرزا نے مبارکباد کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ کچھ دے ڈالیے، میرا مطلب خلعت ریشمی نہیں، حریر نہیں ایک کمبل ہی سہی۔

مقصود از لباس بہاں پوشش تنست پوشش گر از حریر نباشد گلیم باد

معشوق سے آنے کی التجا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اچھا اگر تو میرے انتظار کا یقین نہیں کرتا تو نہ کر لڑنے کے لیے چلا آ، مگر آ۔

زمن گرت نبود باور انتظار بیا بہانہ جوئے مباش و ستیزہ کار بیا

ایک جگہ معشوق کو بلانے کی یہ ترکیب نکالی ہے۔ کہتے ہیں ہاں صاحب ٹھیک ہے، میں کہتا ہوں کہ پھول گلشن میں بڑا اچھا معلوم ہوتا ہے، لیکن آپ اس کو غلط سمجھتے ہیں تو غصہ میں باہر چلے آئیے اور میری غلطی ثابت کر دیجیے۔

بے پردہ شو ز غصہ و الزام دہ مرا گفتم کہ گل خوش است بگلشن دریں چہ بحث

مرزا کی سوگوارانہ زندگی پر نظر دوڑاتے وقت پہلی ہی نظر میں اُن کی بدبختی کا اندازہ کر لیتے ہیں اور ان کے مصائب حیات کا نقشہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔

مگر مرزا جہاں کوئی اس قسم کا واقعہ بیان کرتے ہیں اس کو اس طرح رنگ دیتے ہیں کہ حزن و ملال کے پہلو بھی ایک نشاط آمیز تصور ہو جاتا ہے۔

ایک قطعہ میں اپنی بد نصیبی کا بیان کرتے کرتے کہتے ہیں کہ میاں غالب آخر یہ بات کیا ہے کہ تم آج کل اس قدر مفلس و محتاج ہو رہے ہو۔ نہ کھانے کا سامان ہے نہ پینے کا۔ نہ کہیں سے پیسہ ملتا ہے نہ ٹکا ——— نہ اپنوں سے نفع ہو پہنچتا ہے نہ بیگانوں سے جب یہ مانی ہوئی بات ہے کہ خدا رزاق ہے اور بندوں کے رزق کا کفیل ہے پھر آخر تمھیں کیوں نظر انداز کر دیا ہے یہ بھی معلوم ہے کہ نہ تو خدا بخیل ہے۔ اور نہ آپ ابھی مر ہی گئے ہیں۔ تو یہ کیا غضب ہے کہ تم قوت لایموت کے لیے بھی محتاج ہو ——— معلوم یہ ہوتا ہے عرصہ سے تمھارا آب و دانہ اٹھ گیا ہے، اور تمھارے مار ڈالنے کا حکم خدا کی طرف سے جاری ہو چکا ہے۔ فرشتۂ رزق بالکل بے خطا ہے اگر تمھارا رزق ہوتا تو ضرور تم کو پہونچتا۔ مگر فرشتۂ موت حضرت عزرائیل، خدا تمھیں زندہ رکھے کچھ ڈھیل ڈال رہے ہیں اور جلد بازی سے کام نہیں لیتے ہیں ؎

ایا زیاں زدہ غالب کہ از حدیقۂ بخت — نمی رسد بتو خار و خسے ز ہیچ سبیل
چو لازم است کہ پروردگار تا دم مرگ — بود برزق خورندۂ عباد کفیل
چراست اینکہ نداری نوا ز سیاہ و سپید — چراست اینکہ نیابی بر از کثیر و قلیل
فتادہ در سر ایں رشتہ عقدۂ ورنہ — نرد تو دونے رازق العباد بخیل
ز چند سال برگ و نوا شاہی رزق — شداست حکم خود از بیشگاہ رب جلیل
فرشتہ ہر کہ وکیل است بر خزائن رزق — نکرد ہیچ توقف برزق در تعطیل
دوم فرشتہ کہ یادش بخیر مقر ولا و — روا ندا نشت در اہلاک شیوۂ تعجیل
لطیفہ کنم از قول شاعرے تضمین — کہ در لطیفہ مرا در اکسے نبود عدیل
اگر خدائے بداند کہ زندہ تو ہنوز — ہزار مشت زند بر دہان عزرائیل

ایک جگہ اپنی بیکسی اور انتہائی کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اپنے گھر میں ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے خود اپنا دربان ہوں۔

ماندہ ام تنہا بکنج از دورباش پاس وضع خانۂ دارم کہ پندارند دربانش منم

ایک جگہ اپنی بہشت کا حال بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہمارے بہشت میں اگر کوئی پھلنے پھولنے اور بڑھنے والا درخت ہے تو دوزخ کا زقوم ہے۔

نور خرد در آگہی خواہش تن پدید کرد صرف زقوم دوزخ نامیہ در بہشت ما

اسی طرح کی ایک اور رباعی ہے کہتے ہیں کہ ساقی روز ازل نے میری قسمت کے پیمانہ میں زہر ہی زہر بھرا ہے، کسی طرح چین نہیں ہے۔ تو سعادت و نحوست کو لیے پھرتا ہے۔ یہ سب فضول ہے، مجھے سعادت نے بھی مارا اور نحوست نے بھی۔

آنم کہ بہ پیمانۂ من ساقی دہر ریزد ہمہ دُرد درد و تلخابۂ زہر
بگذر ز سعادت و نحوست کہ مرا ناہید بغمزہ کشت و مریخ بہ قہر

ایک جگہ کہتے ہیں کہ زمانہ کے رنج و غم نے ہمیں ہر طرح سے تباہ کیا۔ ایک طرف تو خاص لوگوں کے عیش و عشرت نے تباہ کیا، دوسری طرف عوام کی آزادی اور فارغ البالی نے۔

غالب زغم روزگار ناکام کشت از تنگی دل بحلقۂ دام کشت
ہم غیرت سرسبزگی خاصم سوخت ہم رشک نشاط مندی عامم کشت

ایک جگہ معشوق سے کہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح تمھیں آنا چاہیے۔ غیر کے گھر کی طرف سے نہ آؤ تو دوسرے رستے سے آؤ، مگر آؤ ضرور۔ تم نے کہا تھا کہ مجھے بلاتا نہیں۔ میں تمھاری موت ہوں۔ اچھا اب اپنے قول پر قائم رہو۔ میں نہیں بلاتا ہوں موت کی طرح بے بلائے چلے آؤ۔

اے دوست بسوئے این فرد ماندہ بیا از کوچۂ غیر راہ گردانده بیا

گفتی کہ مرا مخواں کہ من مرگ توام برگفتۂ خویش باش دنا خواندہ بیا

ایک جگہ منصورؔ کے دار پر چڑھنے کے واقعہ کو اس شوخی کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ جو احد کو واحد ہی کہے اُس کا انجام وہی ہوتا ہے جو منصور کا ہوا۔ اور جو دو کہتے ہیں ان کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔

منصور عشق زنکتہ چنیاں چہ بود دردا ست خطر زہمنشین چہ بود
چوں عاقبت یگانہ بینان دار است دریاب کہ انجام دو بیناں چہ بود

دنیا میں جس کو دیکھئے جاہل نظر آتا ہے اگر کچھ فرق ہے بھی تو صرف ایسا جیسے خر عیسیٰ اور خر دجال میں۔

ہر چند زمانہ مجمع جہال است در جہل نہ حال شاں بیک منوال است
کو دن ہمہ لیک از یکے تا دگرے فرق خر عیسیٰ و خر دجال است

ایک جگہ کہتے ہیں۔ میاں غالبؔ ہم نے یہ مانا کہ آپ بڑے سخن گو ہیں اور اس وقت کوئی آپ کا مد مقابل نہیں ہے، مگر جناب کے دماغ میں خبطِ لطیف کی بہت کمی ہے۔ آپ کی خواہش یہ ہے کہ شراب مفت بھی ملے، نادر و نایاب بھی ہو، اور بہت ہو، سو حضرت یہ تو ممکن نہیں ہے، بادہ فروش کوئی ساقی کوثر تو ہے نہیں کہ یہ سب باتیں آسانی سے آپ کو میسر ہو سکیں۔

غالب بہ سخن گرچہ کست ہمسر نیست از لغزش ہوش ہیچت اندر سر نیست
مے خواہی و مفت و نغز و دانگہ بسا کہ ایں بادہ فروش ساقی کوثر نیست

ہر کس ز حقیقت خبرے داشتہ است بر خاک رہ عجز سرے داشتہ است
زاہد ز خدا لازم بہ دعوئ طلب شداد بہا حا پسرے داشتہ است

یعنی ہر وہ شخص جو اپنی ذاتی حقیقت سے آگاہ ہے وہ ہمیشہ عجز و فروتنی سے کام لیتا ہے، لیکن زاہد کی انانیت دیکھئے کہ وہ خدا سے بہشت طلب کرتا ہے اور دعوے

کے ساتھ، اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ وہ شدّاد کی نسل سے ہے اور وراثتاً بہشت شدّاد کا طلبگار ہے۔

گردیدنِ زاہداں بہ جنت گستاخ　　دیں دست درازی بہ ثمر شاخ بہ شاخ
چوں نیک نظر کنی ز روئے تشبیہہ　　ماند بہ بہائم دعلف زارِ فراخ

جنت کا تصور زاہدوں نے پیش کیا ہے کہ وہ ایک باغ ہے پھل والے درختوں کا جس کے پھل اہلِ بہشت آزادی سے توڑ توڑ کر کھاتے پھریں گے۔ اس پر غالب طنز کرتا ہے کہ اگر یہ بیان صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جنت ایک وسیع چراگاہ ہے جس میں زہاد جانوروں کی طرح آزاد چھوڑ دیے جائیں گے اور ہر جگہ چرتے پھریں گے۔

درعالم بے زری کہ تلخ است حیات　　طاعت نہ تواں کرد بہ امید نجات
اے کاش زحق اشارت صوم وصلوٰۃ　　بودے بہ وجود مالِ چوں حج و زکوٰۃ

غربت و افلاس کے عالم میں بہ اُمید نجات طاعت وعبادت کا سوال نہایت عجیب وغریب ہے۔ ہونا یہ چاہیئے تھا کہ جس طرح حج و زکوٰۃ کے لیے مقررہ مال کا پایا جانا ضروری ہے، اسی طرح روزہ نماز کے لیے بھی کوئی شرط ہونا چاہیئے تھی، یہ کیا کہ کھانے کو پاس نہیں لیکن نماز ضرور پڑھو اور روزہ ضرور رکھو۔

باید کہ دولت زغصہ برہم نشود　　از رفتن زر ز دست خوش غم نشود
ایں سیم ونداست خواجہ ایں سیم و زر است　　غم نیست کہ ہر چند خوری کم نشود

یعنی لوگوں کا یہ کہنا کہ دولت ہاتھ سے نکل جائے تو غم نہ کرو، سمجھ میں نہیں آتا۔ لوگ دولت اور غم کے فرق کو جانتے ہی نہیں، دولت تو خرچ کرنے سے ختم ہو جاتی ہے لیکن غم کا یہ حال ہے کہ جتنا کھاؤ وہ کم ہونے میں نہیں آتا۔

یارب جہانیاں دل خرم دہ　　در دعوی جنت آشتی باہم دہ
شداد پسر نداشت باغش از تست　　آں مسکن آدم بہ بنی آدم دہ

اللہ تعالیٰ سے التجا کر رہے ہیں کہ اے خدا یہ دنیا والے جو جنت کے دعویدار ہیں۔ ان کو تسلیم کرنے کی توفیق عنایت فرما۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شداد کا کوئی وارث نہیں تھا۔ کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے اس کا باغ ضبط کر لیا گیا مگر جنت کا باغ ہمارے باوا آدم کا تھا۔ آدم کا مسکن بنی آدم کو مل جانا چاہیئے۔ اُن کی اولاد موجود ہے شداد کی طرح وہ لاولد نہ تھے۔

مرزا کا طنز و مزاح فارسی نثر میں

مرزا اڑتیس اُنتالیس برس کی عمر میں کلکتہ گئے۔ اُن کے بعض دوست پہلے ہی سے وہاں موجود تھے، مگر اُن سے ملنے پر اور بھی نئے دوست پیدا ہو گئے۔ جب دوبارہ دلی واپس آئے تو ایک اچھی خاصی تعداد اُن کے احباب کی کلکتہ میں موجود تھی۔ انہیں میں سید علی اکبر خاں تھے جو ہگلی بندر کے امام باڑہ کے متولی تھے۔ مرزا سے اور اُن سے نہایت بے تکلفانہ دوستی ہو گئی تھی۔ انہیں کے نام ایک خط میں آموں کی فرمائش کرتے ہیں۔ انداز بیان کی ظرافت آمیز ندرت دیکھیے۔

قبلۂ خدا پرستاں سلامت!

ممدوح از ستائش مستغنی و مادح در بیان نارسا۔ چہ گویم تا آبروئے خموشی نریزد و چہ گویم تا داغ کوتہ قلمی برخیزد ——— ایں عبودیت نامہ را تماشی، اسلام بر دستائی است۔ دو دائرہ ہر حرفش را پر کار کاسہ گدائی شکم بندہ ام۔ و قدرے ناتواں۔ ہم آرایش خوان جویم۔ و ہم آسائش جاں۔ خردوراں دانند کہ ایں ہر دو صفت با انبہ انور است۔ واہل کلکتہ برانند کہ قلمرو ہگلی بندر است۔ آرے انبہ از ہگلی۔ و گل از گلشن۔ التماس از جناب۔ و سپاس از من۔ شوق می سگالد کہ ہر آئینہ تا پایان فصل دو سہ بار بجا طرد ولی نعمت خواہم گزشت داد آزمی نالد۔ کہ حاشا بدیں مایہ برخورداری

خورسند نخواہم گشت۔"

پہلے تو وہ اپنی شوخی القاب سے ظاہر کرتے ہیں۔ آگے بڑھتے ہیں تو ان القاب آداب و مزاج پرسی و ظاہری تعریف سے قطع نظر کرکے کہتے ہیں کہ مجھے نہ تمہیں تعریف سننے کا شوق۔ نہ مجھ میں تعریف کرنے کا دم۔ خط کو خط نہیں بتاتے بلکہ سلام روستائی کرتے ہیں یا کاسۂ گدائی، پھر حسنِ طلب ملاحظہ ہو۔ کہتے ہیں۔ کچھ تو میں پیٹ کا بندہ ہوں اور کچھ ناتوان۔ لہٰذا اس کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ آرایشِ خوان، آسایشِ جان۔ اب ایسی چیز کہاں ہے جس میں یہ دونوں صفات موجود ہوں۔ مگر لوگوں کی رائے میں یہ دونوں باتیں آم میں ہیں اور کلکتہ والوں کا خیال ہے کہ آم ہگلی بندر میں ہوتا ہے سچ ہے جو کچھ کہتے ہیں ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ چار چیزیں چار جگہ ہیں۔ آم ہگلی میں پھول میں۔ ایثار جناب میں اور شکر خاکسار میں مگر ایک عجیب بات سنیے مجھ میں دو چیزیں ہیں۔ شوق اور حرص۔ دونوں مختلف ـــــــ شوق تو کہہ رہا ہے کہ فصل بھر میں کم از کم میرے آقائے نعمت دو تین بار مجھے یاد کریں گے۔ اور حرص کہتی ہے۔ کہ واہ۔ دو تین بار میں میرا کیا بھلا ہوگا۔

منشی محمد حسن مرزا کے کوئی خاص دوست تھے۔ اُن کے صاحبزادہ احمد حسن کی شادی ہوئی۔ مرزا کو قصیدہ نہیں تو کم از کم کوئی سہرا ضرور لکھنا چاہیے تھا۔ مگر خدا جانے عدیم الفرصت تھے، فکرمند تھے یا اور کوئی بات تھی، کچھ بھی نہ کرسکے۔ آخرکار معذرت میں ایک خط لکھا۔ جس میں وہ سب کچھ لکھ گئے جو ایسے مواقع پر بہ سلسلۂ تہنیت لکھا جا سکتا ہے۔

"ہم در و دیوار را لبریز جوشش بہار افزودمے۔ و ہم گوشہ و کنار گیتی را بفروغ نیر بخت چراغاں نمودمے۔ تار از طرۂ حور۔ و پود از بال پری

آوردمے۔ و نو آئین نمطے درہم یافتہ بداں ہمایوں انجمن گستردمے۔
بر بساط محفل میوہ و گل از طوبے فشاندمے۔ و زہرہ را برامشگری و
رضواں را بہ مہمانی خواندمے۔"

یعنی مجھے توفیق ہوتی تو در و دیوار سجاتا۔ چراغاں کرتا، طرفہ حور و بال پری سے فرش طیار کر کے اسے محفل میں بچھاتا، شجر طوبیٰ کے میوے اور پھول لٹاتا، زہرۂ فلک کو رقص دعوت دیتا اور رضوان کو بھی اس بزم میں شریک کرتا۔

مرزا کو اپنی جاگیر کے معاملہ اور مقررہ رقم کے لیے فیروزپور جانا پڑا۔ وہاں نواب نے کچھ امیدیں دلائیں، معاملہ کے انفصال کا اطمینان دلایا اور مرزا صرف اس وعدہ پر مطمئن ہو کر دہلی چلے آئے۔ مدتیں ہو گئیں مگر کچھ انفصال معاملہ نہ ہو سکا۔ ناچار ہو کر مرزا علی بخش خاں کو جنھیں مرزا، بھائی کہتے تھے اور اپنا معین و مددگار سمجھتے تھے۔ ایک خط لکھا جس کا ہر فقرہ اُن کی دل برگشتگی اور انتظار کا پتہ دیتا ہے، دو تین فقرے غصہ اور انتظار کا پتہ دیتا ہے، دو تین فقرے غصہ اور انتظار کی انتہا کو ظاہر کرتے ہیں، اپنے خاص رنگ میں فرماتے ہیں:-

"دیکچند بامید نواب صاحب ساختم، و از تاب آتش انتظار گداختم۔
نشستہ ام بہ عذابے کہ مجرم بزنداں نشیند۔ و می بینم آنچہ کافر بہ جہنم بیند۔"

ایک مرتبہ دوپہر کو ظہر کے وقت مرزا مفتی صدرالدین آزردہ کے یہاں پہونچے، کنڈی ہلائی، اندر سے نوکر نکلا، جواب دے گیا کہ مفتی صاحب موجود نہیں ہیں۔ مرزا واپس آئے اور آکر اسی روز مفتی صاحب کو ایک خط لکھا۔ جس میں نوکر کے باہر نکلنے اور اپنے پلٹنے کو عجب دلکش انداز سے تشبیہ دے کر فرماتے ہیں:-

"بانا آں پرستاران براں برآمدن کام دل دشمن بود۔ و من
دریں برگشتن بخت خویشتن۔"

شیخ امام بخش ناسخ کا دیوان طبع ہوا تو انھوں نے ایک جلد سوسی جان کی معرفت مرزا کے پاس بھی روانہ کی۔ مرزا نے جواب میں شکریہ لکھا اور ایک بڑا چبھتا ہوا فقرہ بھی تحریر فرما دیا۔

"بخت را برسائی ستایم - و بندا ام - کہ بہ طور معنی رسیدہ ام
خود را بہ در اشنائی آفریں گویم و انگارم کہ موسیٰ را بید بیضا دیدہ ام۔"

مرزا کے ایک دوست لالہ ہیرا لال ایک مرتبہ مولوی فضل حق خیر آبادی سے ملنے گئے۔ وہاں پہونچ کر معلوم ہوا کہ مولانا کے مکان کے قریب آگ لگ گئی تھی۔ مگر اتفاق سے مولانا کا نقصان بالکل نہ ہوا۔ یا ہوا تو اتنا کہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ جب واپس آئے اور مرزا سے ملاقات ہوئی تو اس حادثہ کی بھی خبر دی۔ مرزا نے فوراً مولانا کو ایک شکایتی خط لکھا۔ اور اس بات پر افسوس کیا کہ آپ نے اتنے بڑے جانکاہ حادثہ کی مجھے اطلاع بھی نہ دی۔

"ہائے اے وفا دشمن۔ بیگانگاں کامیاب پیام و نامہ۔ و آشنایاں
جگر تشنۂ رشحۂ خامہ سے

وائے برمن کہ رقیب از تو مرا نیاید نامۂ واقدہ مہر بہ عنواں زدہ"

ایک مرتبہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کا خط آیا۔ خط میں شعر و شاعری کا کوئی ذکر نہ تھا۔ مرزا نے پڑھ کر جواب دیا اور جواب میں وہ ظرافت آمیز تشبیہیں بھی استعمال کر گئے، اس زمانہ میں شانہ میں درد تھا فرماتے ہیں۔

"سحر گاہے کہ ... دلم از درد شانہ، چنانکہ مومن ہر میشہ از رنج
ہمسایہ در آزار باشد، بیقرار بود۔ سر وشے از ... آمد بہ پیردن

بہار ساماں نامہ، گل بجیب تماز نیست۔

قدسی مفاوضہ از شعر و غزل چوں نامۂ اعمال زاہد از ذکر مے و شاہد

سادہ بود۔"

دونوں جگہیں تشبیہیں بڑی نادر استعمال کی ہیں ــــــــ دل کو موسم بہار ہے

اور دردشانہ کو رخ ہمسایہ کہنا تو لطیف تھا ہی، خط میں جو شعر و شاعری کا ذکر نہ

تھا تو اُس کو نامۂ اعمال زاہد کی طرح سادہ کہنا لطیف تر بات تھی۔

ایک مرتبہ شیفتہ مرحوم کا عرصہ تک خط نہ آیا۔ مرزا نے اپنے رنگ میں یہ شکوہ کیا:۔

مے رنجد از تحمل بار جفائے خویش ہاں شکوہ کہ خاطر دلدار نازک است

اگر بے پروائیست چنیں نمی بایست، و اشکیب آزمائی است۔ نہ بدیں

اندازہ روا بود۔ اگر از ناکسی بالتفات نیرزم۔ ناکساں را بہ سخن دلیر کردن

و ننگ شکوہ بے شکوہاں بخود پذیرفتن از چیست۔ و اگر ایں تغافلہائے

بے محابا و فراموشی ہائے جانگزا از عالم مکافات بہ مثل است مرا کہ

بزہ مندم بہ گلہ ننواختن و سازیوزش مرا بنوا در دن گناہ کیست؟

الفاظ ایسے نہیں کہ اُن سے خندہ یا ضحک پیدا ہو۔ مگر پھر بھی یہ منطقی استدلال

کس قدر لطیف ہے کہ اگر بے پروائی ہے تو اتنی نہ چاہیے تھی۔ اور اگر صبر آزمائی

ہے تو اتنی صبر آزمائی کی ضرورت نہ تھی۔ اور اگر نالائقی کی وجہ سے میں التفات

کے قابل نہیں تو پہلے مجھ سے نامہ و پیام کیوں کیا۔ اور اگر بدلہ لیا گیا ہے اور میری

غفلت کا جواب دیا ہے تو پھر مجھے شکوہ سے کیوں محروم کیا گیا ــــ میں گنہگار

تھا تو مجھے متنبہ کیا جاتا۔

مفتی صدر الدین آزردہ سے سفارش چاہتے ہیں اور عجیب طرح سے اپنا حق

ثابت کرتے ہیں۔

"قبلہ حاجات — اگرایں بندہ اندک خشنود بسیار گوئے۔ زود گستاخ،
پُر بیشاں را حق بندگی نیست۔ از کجا کہ بریں بے بضاعتی نتواں بخشود سہ
گیرم وفا ندارد اثر ہم بما گرائے زیں سادگی کہ دل بہ اثر بستہ ایم ما
سخن کوتاہ ہر گونہ عنایت کہ درآں کارسازی بکار رفتہ باقی درحق
گرامی مرزا فضل بیگ صرف گردد۔ اگرچہ آں صرف از اسراف بجائے
رسد کہ بہرہ از بہر من نماند۔"

کس قدر دلچسپ استدلال ہے یہ کہ اگر میرا کوئی حق نہیں ہے تو میری بے بضاعتی
پر رحم کیجیے۔ اس سے پہلے جو سفارش آپ کر چکے ہیں جو کچھ اس میں سے باقی بچی ہو وہ
مرزا فضل بیگ کے حق میں صرف کر دیجیے۔ چاہے یہ صرف اسراف کی حد میں آکر
یہاں تک پہنچ جائے کہ میرے لیے کچھ باقی نہ رہے۔

حکیم مومن خاں ہر سال تقویم بنایا کرتے تھے اور اس فن میں کمال رکھتے تھے۔ مرزا
کو اگرچہ نجوم میں بہت کم دخل تھا پھر بھی ایک مرتبہ حکیم صاحب کو لکھا کہ اگر اس سال
کی تقویم طیار ہو تو ذرا بھیج دیجیے میں بھی نوروز کی کیفیت دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور
اس کے ساتھ ہی ایک مشہور و معروف لطیفہ اپنے انداز خاص میں بیان کرکے
مزاحیہ رنگ پیدا کر دیا فرماتے ہیں :-

"زہے نادان ہوس پیشہ کہ می باشم۔ و بہ شرف خورشید خورسند
گردم حقا کہ دل نہادن من بہ آثار نوروزی بجشم داشت فرخی و فیروزی
از روئے مثال بدا گو بہ آں کنیز کم خرد سال اند۔ کہ چوں شب عید رش نشاطی
تازہ در گرفت و بزمزمہ عید آمد نوائے شادی برگرفت خاتون گفت تن زن۔
اگر عید است در مضان تو دہماں نیم سوختہ نان ۔"

یعنی بھلا میں نوروز دیکھ کر کیا کروں گی۔ میری بالکل ایسی ہی مثال ہے

جیسے کسی لونڈی نے عید کا چاند دیکھ کر خوشی کے جوش میں کہا کہ بیوی، بیوی کل عید ہے بیوی نے جھڑک کے کہا بیٹھ مردار عید ہو یا رمضان تیری قسمت تو وہی جلی روٹی لکھی ہے۔

مسٹر اسٹرلینگ نے مرزا کی کاربرآری کا وعدہ کر لیا تھا اور حتی الوسع وہ ان کے معاملہ میں کوشاں تھے اتفاقاً جوان مر گئے جس کا مرزا کو بیحد صدمہ ہوا۔ اسی زمانہ میں مولوی سراج الدین احمد کو غالب نے (لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور کلکتہ میں ملازم تھے) ایک خط لکھا جس میں اس جواں مرگ کی موت پر افسوس بھی ہے اپنی بدقسمتی کا رونا بھی ہے۔ مگر با ایں ہمہ جس رنگ سے اس کا اظہار کیا ہے اس میں اپنا خاص رنگ نہیں چھوڑا۔ فرماتے ہیں:-

"حیرتے داشتم کہ بمرگ ناگاہ درگذشتن ایر چوں دولت جواں سال مسٹر اندریو اسٹرلنگ ستودہ خصال برائے چیست۔ وکار پردازاں والا کدہ قضا ازیں سانحہ سترگ کدام نتیجہ منظور دارند۔ حالیا حالے شد کہ بہ سیلاب فنا دادن بنائے امیدواری غالب رمیدہ بخت میخواستند واں صورت نمی بست الا بظہور ایں طوفاں ہوشربا۔"

یعنی میں سوچ رہا تھا کہ مسٹر اسٹرلنگ کیوں مرے اور اس جواں سے موت سے کارکنان قضا و قدر کا مطلب کیا ہے۔ اب سمجھ میں آیا کہ اسٹرلنگ کے مار ڈالنے سے صرف میری امیدوں کو برباد کرنا منظور تھا۔ کیونکہ وہ امیدیں جو قائم ہو چکی تھیں اس کے بغیر فنا ہو ہی نہ سکتی تھیں۔

مولوی سراج الدین احمد کو ایک جگہ القاب کے طریقہ پر یہ لطیف فقرے لکھتے ہیں:-

"حبانیکہ ازلطف اجزائے آں بہ تحریر رفتہ وکدورتے چوں دُردانہ

بادۂ خاکستر از آتش وا ماندہ است اگر بپائے دوست افشانم ترسم کہ پائے نازنینش رنجہ گردد۔"

یعنی میرے پاس جان تو ہے مگر ایسی جان ہے کہ اس کے تمام لطیف اجزا تحلیل ہو چکے۔ اب جان باقی رہ گئی ہے لیکن بالکل ایسی جیسے شراب میں دُرد۔ یا آگ میں خاکستر۔ اُسے اگر آپ کے قدموں پر نثار بھی کردوں تو اندیشہ ہے کہ مبادا آپ کے قدموں کو رنج پہنچے۔

مولوی سراج الدین احمد نے ایک مرتبہ مدت دراز کے بعد خط لکھا۔ اور خط میں یہ تحریر کیا کہ میں سمجھا تھا آپ بھول گئے ہوں گے اور وہ جوش خروش محبت باقی نہ رہا ہوگا۔ مرزا صاحب نے جواب میں لکھا۔

"نارسیدن نامہ ام را با افسردگی شوقم حمل کردید، چرا بمرگ من حمل نکردید تا از ادا شناسیہائے شما خورسند بودمے۔ و شمارا اہل دل و دانشور شمردمے"

آپ نے یہ کیوں سمجھا کہ میرا خط نہ لکھنا افسردگی شوق کی وجہ سے ہے۔ یہ کیوں نہ سمجھا کہ میں مر گیا ہوں۔ تاکہ تمھاری ادا شناسیوں سے ذرا جی بھی خوش ہوتا اور تمھیں اہل دل سمجھتا۔

مولوی سراج الدین احمد کے خط سے مرزا احمد کے انتقال کی خبر معلوم ہوئی۔ ابھی مرزا صاحب کلکتہ جانے کا ارادہ رکھتے تھے سخت رنج ہوا اور جواب میں تعزیت کے طریق پر چند دلچسپ فقرے لکھے۔ اتفاق بالائے اتفاق یہ ہوا کہ مرزا احمد اپنے اواخر ایام حیات میں دلی آنے کا ارادہ رکھتے تھے اور مرزا سے وعدہ بھی کر چکے تھے کہ انتقال ہو گیا۔ اسی وعدہ سے متاثر ہو کر مرزا صاحب فرماتے ہیں :-

"می گفت کہ بہ دہلی می آیم۔ وعدہ فراموش را بمروت راہ گرداند۔ و تا قیم بسر منزل دیگر رساند، گر فتم کہ خاطر دوستاں عزیز نداشت چرا بحال خورد سالاں

خود نیز داخت ...... ہنوز ہنگام مردن مرا حمد نبود۔ چرا آں قدر صبر نکرد کہ بہ کلکتہ رسیدے۔ و روئے نظارہ فروزش دگر بارہ دیدے چرا آشنا یہ در رنگ نورز دید کہ.... حامد علی جواں گشتے۔

یعنی مرزا احمد نے اتنا بھی نہ کیا کہ میں اُن سے کلکتہ آکر مل لیتا اور پھر مرتے۔

ایک مرتبہ مولوی صاحب موصوف نے مرزا کو لکھا کہ جو کچھ اس زمانہ میں کہا ہو وہ سب خط میں لکھ کر بھیج دیجیے، مرزا صاحب نے جواب میں لکھا۔

"نفس در باد پیمائی درنگ ندارد۔ فراواں خون خوردہ و جہاں جہاں پارۂ دل بدامن شمردہ می شود۔ اگر خواہم کہ ہمہ آں را بورق اندر آرم نامہ از درازی بہ کلکتہ رسد و رقم انجام گرائے نگردد"

فرماتے ہیں کہ کیا پوچھتے ہو بہت خون جگر کھایا ہے۔ بہت کچھ کہا ہے۔ اگر سب کو لکھنے کا ارادہ کروں تو کاغذ اتنا لمبا ہو جائے گا کہ دلی سے کلکتہ تک پہونچ جائے گا۔ اور پھر بھی سب نہ لکھ سکوں گا۔

"زنہار صدر زنہار، اے مولوی سراج الدین بترس آں از خدائے جہاں آفریں، کہ چوں قیامت قائم گردد۔ داد فریدگار براد بہ نشنید۔ من گریاں و مو بہ کناں دراں ہنگامہ آیم و در تو آویزم، دگویم کہ ایں آنکس است کہ یک عمر مرا بہ محبت فریفت و دلم برد۔ من از سادگی بر وفا تکیہ کردم ــ وایں را از دوستاں برگزیدم۔ نفس کم باخت و بہ من بے وفائی کرد۔ خدا را بگو کہ آں زماں چہ جواب خواہی داد۔ و چہ عذر پیش خواہی آورد۔ وائے بر من کہ روزگار ہا گذر د و خبر نداشتہ باشم کہ سراج الدین احمد کجاست و چہ حال دارد۔ اگر جفا یاد اش وفاست۔ سبحان اللہ بر قدر توانی بیفزائے کہ اینجا جہد و وفا فزا داللہ"

لاجرم جفا نیز باید کہ فراواں باشد۔ واگر خود ایں تغافل بیاد افزاہ جرمے دیگر است نخست گناہ مرا خاطر نشاں باید کرد و آنگاہ انتقام باید کشید تا شکوہ درمیان نگنجد۔

جب قاضی محمد صادق خاں اختر نے تذکرہ آفتاب عالم لکھا تو مولوی سراج الدین احمد کی معرفت مرزا کو بھی لکھا کہ کچھ انتخاب کر کے کلام بھیجیے، کچھ خاندانی حالات لکھیے۔ مرزا صاحب نے بہت سے عذر و معذرت کے بعد لکھا کہ جو کچھ بُرا بھلا کلام ہے وہ سب ایک دیوان میں جمع کر لیا گیا ہے۔ اُس سے انتخاب فرمایئے جب آپ خود صاحب ذوق ہیں تو یہ کام آپ ہی کیجیے۔ رہا حالات لکھنا، سو میرے نزدیک تو یہ لکھ دیجیے تو مجھ پر احسان ہوگا۔

"از ناکسان روزگار۔ و بیکسان دہلی دیار مسلمان زادہ ایست کافر ماجرا۔ دیگرے است مسلمان نما۔ کہ از غلط نمائی غالب تخلص میکند"۔

مرزا اپنی پنشن وغیرہ کے معاملہ کے لیے جب فیروز پور پہونچے تو اتفاق سے نواب احمد بخش خاں صاحب تشریف فرمانہ تھے کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ مرزا انتظار میں ٹھہر گئے۔ مگر بڑے بڑے زمانہ گزر گیا نواب صاحب نہ آج تشریف لاتے ہیں نہ کل۔ عاجز آگئے راے چھجمل کھتری کو جو نواب صاحب کے معتمد خاص تھے ایک خط لکھا اور دریافت کیا کہ خدا کے لیے سچ سچ اور جلد سے جلد لکھیے کہ نواب صاحب کب تک آئیں گے۔ میں پریشان ہو گیا ہوں۔ یہی لکھتے لکھتے چند فقرے بہت دلچسپ لکھ گئے، فرماتے ہیں:۔

"ہویدا است کہ از قفس جستہ بدام افتادہ را چہ حال خواہد بود۔ وا ز دست نے بنا خن فرو رفتہ کدام عقدہ خواہد کشود۔ جلائے وطن، وعزم سفر، وا حرام غربت، مصیبتے است کہ نصیب ہیچ آفریدہ مبادا دے

برنگون طالعیہا۔ دردیدہ سنجیہائے کسے کہ اینہا را آرزو خواہد۔ ہر

چند در وطن نیم اما قرب نیز قیامت است۔ ہنوز با اہل کاشانہ راہ

نامہ و پیام است۔ ہرچہ دیدہ می شد آشوب چشم بود۔ ہرچہ شنیدہ

میشود زحمت گوش است۔ نیم جانے کہ از آں ورطہ بیرون آوردہ

ام مگر ودیعت خاک فیروز پور است۔ کہ مرا اینہمہ اقامت اضطراری

افتادہ ورگے کہ بیش ہزار آرزو از خدائے خواہم گر ہمہ دنیا سرزمین

موعود است۔ کہ ایں قدر درنگ افتادگیہا رو داد۔"

نواب مصطفیٰ خاں کو ایک مشاعرہ کے بابت لکھتے ہیں۔ اور اس میں اپنے مشاعرے کی شرکت کو یوں بیان کرتے ہیں کہ کل جمعہ کا دن گزرنے کے بعد رات کو مشاعرہ تھا۔ چوں کہ میں نے غزل وزل کبھی نہیں تھی۔ اسی تہی دستی کی شرمندگی کی وجہ سے بہت حیران تھا اور مشاعرہ میں جانے کا بالکل ارادہ نہ تھا۔ نواب ضیاء الدین خاں سلمہٗ نے دو فرشتے میرے اوپر مقرر کر دیے۔ زین العابدین خاں عارفؔ اور غلام حسین خاں محوؔ۔ یہاں تک تو سیدھی سیدھی طرح حال لکھا ہے۔ اس کے بعد اپنا وہی رنگ شروع کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"ایں ہر دو ابرام پیشہ شام گاہ بخلوت من آمدند و فیل آمدند

وبہ افساں کہ شیر را چوں شکار کنند بر فیل بار کنند مرا با انجمن بردند۔"

نواب علی بہادر مسند نشیں باندہ نے جو مرزا کے نادیدہ دوست اور شاگرد تھے ایک مرتبہ خط میں لکھا کہ منشی نادر حسین خاں آپ سے ملنے کے بہت مشتاق ہیں، مرزا نے جواب میں یہ فقرہ لکھا:۔

"بخدمت شفیقی منشی نادر حسین خاں صاحب سپاس

می گزارم و سلام عرضہ میدارم، دانستم کہ دیدن غالب را طالب

اندھا شاکہ ایں داعیہ تنہا از انسو باشد۔ اگر بسیار فروتنی کنم گویم کہ
شریک غالب۔

ایک مرتبہ مولوی رجب علی خاں کو مارچ ۱۸۵۱ء میں ایک خط لکھا۔ کوئی جواب نہ آیا۔ مارچ ۱۸۵۲ء میں مولانا کا ایک خط آیا۔ جس میں انھوں نے اتمام فرمایا کہ آپ کا کوئی خط نہیں آیا۔ نکرہے مرزا جواب میں فرماتے ہیں:-

"یارب آں نیایش نامہ کہ در ماہ مارچ سال یک ہزار و ہشتصد و پنجاہ و یک عیسوی رواں داشتہ ام تا مارچ سال دیگر رواں۔ نہ نامہ برزدہ عنوان۔ ونہ فرستندہ کہ عبارت از مولانا محمد باقر است نا پروا، ہمانا آں نامہ خود از فراوانی بار مضامین شوق بر برندگان آں مایہ گرانی کرد کہ آں سبکروی گرانمایگان یعنی بریدان ڈاک انگریزی را بے سپول دو صد کروہ جز بغرض یک سال نتوانستند برید۔"

یعنی یا اللہ جو خط مارچ ۱۸۵۱ء میں بھیجا گیا ہے، وہ مارچ ۱۸۵۲ء تک رواں ہے۔ یہ بات کیا ہے نہ خود خط بیہودہ، نہ خط بیہودہ، نہ خط لکھنے والا۔ بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ نامہ مضامین شوق سے وزنی ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ خط لے جانے والوں کو اتنا بوجھل معلوم ہوا کہ دو سو کوس کا راستہ ایک سال کے بغیر طے نہ ہو سکا۔

شوخی و ظرافت اردو کلام میں

غالب کے اردو کلام میں بھی ہم کو شوخی و ظرافت کی متعدد مثالیں ملتی ہیں، لیکن بلحاظ کیفیت و کمیت فارسی سے کم۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ فارسی زبان میں تعبیر و تعلیل کی بڑی گنجائش ہے، دوسرے یہ کہ فارسی میں تراکیب اضافی و توصیفی کی وجہ سے نہایت تنوع کے ساتھ بڑے وسیع مفہوم کو بھی مختصر الفاظ میں ظاہر کیا جا سکتا ہے برخلاف اس کے اردو اپنے حروف روابط و اشارہ، صلہ و ضمیر کی وجہ سے اتنی

گرانبار ہے کہ شعر کا کافی حصہ ان کی نذر ہو جاتا ہے۔

فارسی میں جہاں حرف اک، حرف کی حرکت سے کام نکلتا ہے۔ اردو میں اس کے لیے پورا لفظ لانا پڑتا ہے۔ مثلاً اردو میں اضافت کے لیے کا، کی، کے لانا ضروری ہے۔ لیکن فارسی میں صرف زیر کی حرکت سے یہ مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ضمائر و اسماء اشارہ کے لیے اردو میں پورا لفظ (یہ۔ وہ۔ میں۔ تم۔ ہمارا۔ تمھارا) استعمال کرنا لابدہے لیکن فارسی میں صرف ایک حرف سے یہ مفہوم ادا ہو جاتا ہے۔

بہر نوع فارسی نحو میں اختصار کی بڑی گنجائش ہے جو اردو میں نہیں اور اسی لیے غالب کی ظرافت و شوخ نگاری اردو میں عروج کو نہ پہونچ سکی۔ تاہم اس سے انکار ممکن نہیں۔ اردو میں بھی کافی شوخ نگاری سے کام لیا ہے اور اس خصوصیت کے ساتھ کہ اس میں بازاری پن کا کہیں نام نہیں۔ اردو کے دوسرے بڑے بڑے شعراء (میر، ذوق، سودا، انشا، ناسخ، مصحفی، داغ وغیرہ) کے یہاں بھی طنز و ظرافت کا عنصر نظر آتا ہے، لیکن کبھی کبھی سوقیانہ حد تک پہونچ جاتے ہیں ـــ غالب نے باوجود رند شاہد باز ہونے کے کبھی شرافت و تہذیب کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ نہ اردو میں نہ فارسی میں ـــ اردو میں غالب کی اس متین و شایستہ شوخی و ظرافت کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق — آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ — مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات — سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی — سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں — کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

ایک جا حرف وفا لکھا تھا سو بھی مٹ گیا — ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالب ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو کیا بات ہے تمھارے شراب طہور کی

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے

ان کے بیاں مشکل ہی سے دو چار اشعار ایسے مل سکیں گے جنھیں ہم نامناسب شوخی کی مثال میں پیش کر سکیں یا جو ذوق پر گراں ہوں مثلاً:-

بوسہ نہیں نہ دیجیے دشنام ہی سہی آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

غالب کی ظرافت کی یہ خصوصیت کہ کبھی کبھی اس میں شدید تلخی غم بھی شامل ہوتی ہے، شاید ہی کہیں اور مل سکے مثلاً ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیے:-

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں

یہ اشعار محض شوخی و ظرافت نہیں، بلکہ ان میں تلخی غم و بیچارگی عشق کا شدید احساس بھی پایا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ قوت صبر و تحمل کا اظہار بھی۔

آہنگ غالب

جن حضرات نے کلام غالب کا غائر مطالعہ کیا ہے، اُن سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ ہو گی کہ اس کے کلام کا ایک خاص آہنگ...

ہے، جو حسنِ تعبیر، ندرتِ تمثیل، جدتِ ادا و شوخیِ بیان کے امتزاج سے پیدا ہوا ہے لیکن یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اُس کے اس "آہنگ" کے دلکش ہونے کا سبب صرف اس کی قدرتِ زبان و بیان ہے۔

اس کے اشعار کسی ایسے ایرانی کے سامنے پڑھیے جو غالب سے واقف نہیں، تو وہ کبھی نہ سمجھ سکے گا کہ یہ کسی "ہندی نژاد" کا کلام ہے۔ وہی محاورات، وہی ترکیبیں، وہی الفاظ کا رکھ رکھاؤ اور وہی بے ساختہ پن جو کسی خوش ذوق ایرانی شاعر کے کلام میں پایا جا سکتا ہے، اس کے یہاں بھی ہے۔

عرفی کا ایک شعر ہے:-

خوش آنکہ پیشِ تو پرسند حالِ عرفی داد
شکایتے بہ کنایت ز روزگار کند

زبان، اندازِ بیان و مفہوم کے لحاظ سے کتنا پاکیزہ شعر ہے۔ غالب اسی چیز کو یوں پیش کرتا ہے:-

دوش کز گردشِ بختم گلہ بر دے رِ تو بود
چشم سوئے فلک و روئے سخن سوئے تو بود

غالب کے اس شعر میں یقیناً ربودگی کی وہ کیفیت پائی جاتی ہے جو عرفی نے "پیش تو پرسند" سے پیدا کی ہے، لیکن شوخی اور لطفِ بیان میں اس سے بہتر ہے۔

نظیری کی بہت مشہور غزل ہے، "جاکش نگر، پاکش نگر"۔ اس میں نظیری نے اپنے محبوب کی تصویر کھینچی ہے اُس عالم کی جب وہ کسی اور کا فریفتہ ہوتا ہے۔ لکھتا ہے:-

چشمش براہے می رود مژگانِ نم ناکش نگر
در سینہ دارد آتشے پیراہنِ چاکش نگر

دامے کہ زلف انداختہ در گردنِ سیمینش بیں
خونے کہ مژگاں ریختہ بر دامنِ پاکش نگر

شرم از میاں برخاستہ مہر از دہاں برداشتہ
گفتار بے ترسش ببیں رفتار بیباکش نگر

از کوئے معشوق آمدہ شوریدگاں در حلقہ اش
از صید آہو می رسد شیراں بہ فتراکش نگر

غالب نے بھی اسی زمین میں اسی مفہوم کی ایک غزل لکھی ہے۔ بعض ہمقافیہ اشعار

ملاحظہ ہوں :-

"گریہ از بس نازکی رنگ ماندہ برخاکش نگر — واں سینہ سودن از تپش برخاکِ تنا کش نگر
بوسے کہ جانہا سوختے دل از جفا سرجوش بہ بیں — شوخی کہ خونہا ریختے دست از حنا پاکش نگر
آں سینہ کز چشم جہاں مانند جاں بودے نہاں — اینک بہ پیراہن عیاں از روزنِ چاکش نگر
بر مقدم صید افگنی گوشے بر آواز ش بہ بیں — در بازگشت، تو سنے چشمے بلعنت راکش نگر

اس میں شک نہیں کہ نظیری نے بیباک کے قافیہ میں اتنا اچھا شعر لکھا کہ غالب کو یہ قافیہ ترک کر دینا پڑا، لیکن اسی کے مقابلہ میں پاک کے قافیہ میں وہ نظیری سے بڑھ گیا۔ نظیری کے یہاں دامن کو پاک کہنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

"دست از حنا پاکش" علاوہ اپنی ترکیب کے مفہوم شعر کے لحاظ سے اتنا چست و برمحل استعمال ہوا ہے کہ نظیری کا شعر پھیکا پڑ گیا۔

فتراک کے قافیہ میں نظیری اور غالب دونوں نے محاکات سے کام لیا ہے اور دونوں کا پلہ برابر ہے۔

مطلع میں دونوں نے محبوب کی عاشقانہ بے تابی کا اظہار کیا ہے، لیکن نظیری کے یہاں کوئی لفظ ایسا نہیں جس سے یہ حالت محبوب کے لیے مخصوص ہو جائے۔ غالب نے "از بس نازکی" کہہ کر اس کمی کو پورا کر دیا، علاوہ اس کے نتائج کی شدت بھی غالب کے شعر میں زیادہ ہو۔ ان قافیوں کے علاوہ دوسرے قوافی بھی غالب نے نظم کیے ہیں جن میں تریاک اور ادراک اس کا حصہ ہو گیا ہے۔ ملاحظہ ہوں :-

تا گفتہ خود نفریں شنو تلخ ست بر لب خندہ اش — زہرے کہ پنہاں می خورد پیدا از تریاکش نگر
خوانند بہ اُمید اثر اشعار غالب بر سحر — از نکتہ چینی درگزر فرہنگ و ادراکش نگر

زبان کے لحاظ سے دونوں غزلیں اتنی یکساں ہیں کہ کوئی ایرانی بھی ان میں امتیاز نہیں کر سکتا۔

ایک اور زمین ہے :- " بند ست ، پند ست " جس میں عبدالرحیم خانخاناں اور نظیری دونوں کی غزلوں کا مقابلہ مولانا شبلی نے شعر العجم میں کیا ہے اور اس میں کلام نہیں کہ خانخاناں کی غزل اپنی کیفیت تغزل کے لحاظ سے جواب نہیں رکھتی اور نظیری کا ایک شعر بھی اس قابل نہیں کہ خانخاناں کی غزل کے ساتھ پڑھا جائے۔

اسی زمین میں غالب کی بھی غزل ہے ، جو خانخاناں تو نہیں لیکن نظیری کی غزل سے یقیناً برتر حیثیت رکھتی ہے۔

نظیری کے یہاں الوند اور فرزند کے قافیے تو یکسر آورد و تصنع ہیں۔ اس لیمان کا ذکر بیکار ہے ، البتہ دوسرے قوافی میں غالب و نظیری کا تقابل لطف سے خالی نہیں۔ شکر خند کے قافیہ میں دونوں کی فکر ملاحظہ ہو :-

نظیری	غالب
دراز دستی حسن کہ گل بہ چشم ریخت	نگاہ بہر دل سرنداده چشمہ نوش
کہ تا بدامنم از جیب در شکر خند ست	ہنوز عیش باندازہ شکر خند ست

نظیری لکھتا ہے کہ کس حسن کی دراز دستی نے میری نگاہ کے سامنے پھول ہی پھول کھلا دیے ہیں کہ جیب سے لے کر دامن تک شکر خند نظر آتا ہے۔

" شکر خند " تبسم کو کہتے ہیں ، اس لیے نظیری کے دوسرے مصرعہ کے لحاظ سے بیان میں تنزل پیدا ہوگیا ہے ، جو معنوی نقص سے خالی نہیں۔ برخلاف اس کے غالب نے شکر خند کے اصلی مفہوم سے شعر کو باہر جانے نہیں دیا ــــ وہ کہتا ہے کہ باوجود محبوب کے التفات کے بھی پوری مسرت مجھے حاصل نہیں اور اس وقت تک میرا عیش تبسم کی حد سے آگے نہیں بڑھا۔

ایک اور شعر :-

نظیری   بہ حرف اہل غرض قرب بعد ما بند ست   دل شکستۂ ما را ہزار پیوند ست

غالبؔ :- درازدستی من جا کے ارفگند چہ عیب
زبیش، دلق ورع با ہزار پیوند ست

نظیریؔ کا پہلا مصرعہ بہت الجھا ہوا ہے اور غزل کی زبان کے لیے جو سلامت و روانی چاہیئے وہ اس میں نہیں پائی جاتی، برخلاف اس کے غالبؔ کا پورا شعر سانچہ میں ڈھلا ہوا ہے اور شوخی کی لطافت تو خیر ظاہر ہی ہے۔

مقطع میں دونوں نے ایک ہی قافیہ استعمال کیا ہے :-

نظیریؔ	غالبؔ
نظیریؔ از تو بجاں کندن ست لب بکشائے	نہ آں بود کہ وفا خواہد از جہاں غالبؔ
بایں قدر کہ بگوئی "بمیر" خورسند ست	بدیں کہ پرسد و گویند "ہست" خورسند ست

نظیریؔ کہتا ہے کہ حالت جاں کنی کی ہے اور اگر اس وقت تو اتنا بھی کہدے کہ "مرجا" تو میری خوشی کے لیے کافی ہے۔

غالبؔ کے شعر مفہوم کے لحاظ سے بہت بلند ہے، وہ کہتا ہے کہ "میں اہل دُنیا سے وفا کا طلبگار نہیں، اگر وہ میرے سوال کے جواب میں صرف اتنا ہی کہہ دے کہ "وفا کا وجود ہے" تو میں اسی پر خوش ہوں۔ غالبؔ نے جس خوبی سے اپنی وفا کی طرف کنایہ کیا ہے، اس کی داد نہیں دی جا سکتی، آرزومند کے قافیہ میں خانخاناں نے قیامت کا شعر کہہ دیا تھا۔

شمارِ شوق ندانستہ ام کہ تا چند ست جز ایں قدر کہ دلم سخت آرزومند ست

اور اسی لیے نظیریؔ کو یہ قافیہ لینے کی ہمت نہ ہوئی۔ غالبؔ نے البتہ اس قافیہ میں ایک شعر لکھا ہے اور بالکل نئے زاویہ سے :-

زبیم آنکہ مبادا بمیرم از شادی نگوید ارچہ بمرگ من آرزومند ست

محبوب میری موت تو چاہتا ہے لیکن اس کا اظہار اس لیے نہیں کرتا کہ کہیں مجھے

شادی مرگ نہ ہو جائے اور فرط مسرت سے میری موت اسے منظور نہیں۔

بند کا قافیہ خانخاناں اور نظیری دونوں کے یہاں نہیں پایا جاتا لیکن غالب نے اس کا استعمال نہایت لطیف شوخی کے ساتھ کیا ہے۔

نہ گفتہ کہ بہ تلخی بساز و بند پذیر ۔۔۔ بر و کہ بادۂ ما تلخ تر از ین بند است

اب ہم اس کے چند اشعار مختلف رنگ کے پیش کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ بے ساختہ پن، سلاست و حلاوت، خوبی زبان اور چستی بندش کے لحاظ سے اس کا ذوق کتنا بلند و لطیف تھا۔

از بسکہ خاطر ہوس گل عزیز بود ۔۔۔ خوں گشتہ ایم و باغ و بہار خودیم ما

در کار ماست نالہ و ما در ہوائے او ۔۔۔ پروانہ چراغ مزار خودیم ما

شکست رنگ تو از عشق خوش تماشائے ست ۔۔۔ بہار دہر ز رنگینی خزان تو نیست

درین روش بچہ امید دل تواں بستن ۔۔۔ میادہ من داد شوق حایل افتادست

چراندر آئینہ با خویش لاابسا زشوی ۔۔۔ ز خود بجوئے کہ ما را چہ در دل افتادست

اے جمال تو بتماراج نظرہا گستاخ ۔۔۔ وے خرام تو بپامالی سرہا گستاخ

زما گسستی و با دیگراں گرو بستی ۔۔۔ بیا کہ عہد وفا نیست استوار بیا

تو زود مستی و ما راز دار خوئے توایم ۔۔۔ شراب در کش و پیمانہ کن حوالۂ ما

شبم تاریک و منزل دور و نقش جادہ ناپیدا ۔۔۔ بلا کم جلوۂ برق شراب گاہ گاہی را

ہرچہ از گریہ فشاندیم بہ نشتر دل ریخت ۔۔۔ ہرچہ از نالہ رساندیم بہ نشتر دل رفت

باید بہ غم خوردن عاشق معاف داشت ۔۔۔ آنرا کہ دل ربودن و نشناختن بیے ست

تاثیر آہ و نالہ مسلم و لے مترس ۔۔۔ ما را ہنوز تجربہ با خویشتن بسے ست

آں راز کہ در سینہ نہاں ست نہ وعظ است ۔۔۔ بر دار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت

پایم از گرمی رفتار ہمی سوخت براہ ۔۔۔ در قدم سوختن خار بپا یا نم سوخت

بہ بانگ صور سر از خاک برنمی دارم | ہنوز در نظرم چشم نیم خوابے ہست
اگر دل نہ خلد ہرچہ از نظر گزرد | زہے روانی عمرے کہ در سفر گزرد
در نگارش روضۂ فردوس نکتہ ایست دلکش | آنکہ او بندد دروغ راست مانندش بود
مسکیں خبر از لذت آزار ندارد | خارم کن و در رہ گزر چارہ گرم ریز
ہر برق کہ نظارہ گداز است نہادش | بگزارد بہ پیمانۂ ذوق نظرم ریز
نہ از مہر است کز غالب بہ مردن نیستی راضی | سرت گردم تو میدانی کہ مردن نیست دشوار

بادہ بردام خوردہ و زر بقمار باختہ | وہ کہ ز ہرچہ ناسزاست ہم بسزا نہ کردہ ایم
تا بچہ مایہ سرکنیم نالہ بعذر بے غمی | از نفس آنچہ داشتیم صرف ترانہ کردہ ایم
خار ز جادہ باز چیں سنگ بہ گوشہ در فگن | در سر رہ گذشتنش ترک بہار کردہ ایم

با تو عرض وعدہ ات حاشا کہ از ابرام نیست | ہرچہ می گوئی ہمی خواہم کہ تکرارش کنم
اختلاط شبنم و خورشید تاباں دیدہ ام | جرأتے باید کہ عرض شوق دیدارش کنم

کردہ ام ایمان خود را دستمزد خویشتن | می تراشم پیکر از سنگ و عبادت می کنم
چشم بد دور التفاتے در خیال آوردہ ام | ہرچہ دشمن می کند با دوست نسبت می کنم

آخر نبودہ ایم در اول خدا پرست | با از نہادگیست اگر بدگماں نئی
دانستہ کہ عاشق زارم نخواندہ ام | دانم کہ شاہدی، نہ گیتی ستاں نئی

غالب کی بعض غزلیں ایسی ہیں جو مطلع سے لے کر مقطع تک مرصع ہیں اور کسی شعر کو آپ کو نظری نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً:-

چوں زبانہا لال و جانہا پر ز غوغا کردۂ | بایدت از خویش پرسید آنچہ با ما کردۂ
گر نئی مشتاق عرض دستگاہ حسن خویشتن | جان فدایت دیدہ را بہرچہ بینا کردۂ
ہفت دوزخ در نہاد شرمساری مضمر است | انتقام است اینکہ با مجرم مدارا کردۂ
صد کشاد آنرا کہ ہم امروز در رنج نمودۂ | مژدہ باد آنرا کہ محو ذوق فردا کردۂ

ذرہ رو شناسِ صد بیاباں گفت ہے | قطرہ را آشنائے ہفت دریا کردہ
دجلہ می جوشد بسا نادیدہ با جویائے تست | شعلہ می بالد گر در سینہ با جا کردہ
جلوہ و نظارہ پنداری کہ از یک گوہر است | خویش را در پردہ خلقے تماشا کردہ

دیدہ می گرید، زباں می نالد و دل می تپد
عقدہا از کارِ غالبؔ سر بسر وا کردہ

اس غزل کا پہلا، دوسرا، چوتھا اور چھٹا اور آخری شعر بالکل اسی رنگ کا ہے، جو تغزل کے لیے فارسی شاعری کے تیسرے دور میں مخصوص تھا۔ تیسرے شعر میں غالبؔ نے اپنی اسی جدت بیان سے کام لیا ہے، جو غالبؔ کی انفرادیت کو ظاہر کرتی ہے، کہتا ہے کہ "مجرم کے ساتھ لطف و مدارا سب سے بڑا انتقام ہے کیونکہ اس طرح جو شرمساری اس پر طاری ہوتی ہے وہ ایسی تکلیف دہ چیز ہے کہ عذاب دوزخ بھی اس کے سامنے کچھ نہیں۔"

ساتواں شعر بھی ابداع بیان کی بڑی پاکیزہ مثال ہے۔ دوسرے مصرعہ کا مضمون نیا نہیں ہے، تصوف کا ذوق رکھنے والے شعراء کے یہاں بکثرت نظر آتا ہے، لیکن غالبؔ نے پہلے مصرعہ میں "جلوہ و نظارہ" کو "از یک گوہر است" کہہ کر، اس مضمون کو بہت شگفتہ بنا دیا۔

غالبؔ نے بعض غزلیں مسلسل بھی لکھی ہیں، اور بڑی دلکش و لطیف!

رفت آنکہ کب بوئے تو از باد کردمے | گل دیدمے و بوئے ترا یاد کردمے
رفت آنکہ گر براہِ تو جاں دادمے زذوق | از موجِ گردِ رہ، نفس ایجاد کردمے
رفت آنکہ گر لبت نہ بنفریں نوا ختے | رنجیدمے و عربدہ بنیاد کردمے
رفت آنکہ جانبِ رخِ وقتے گرفتے | در جلوہ بحث باگل و شمشاد کردمے
اکنوں خود از وفائے تو آزار می کشم | رفت آنکہ از جفائے تو فریاد کردمے

بندم منہ زطرہ کہ تابم نماندہ است رفت آنکہ خویش را بہ بلا شاد کردمے

آخر بداد گاہِ دگر او فتاد کار رفت آنکہ از تو شکوہ بیداد کردمے

غالب ہوائے کعبہ بسر جا گرفتہ است رفت آنکہ عزم خلخ و نوشاد کردمے

یعنی وہ زمانہ گیا جب ہوا سے تیری خوشبو حاصل کیا کرتا تھا اور جب کوئی پھول نظر آتا تھا تو تیری صورت سامنے آجاتی تھی وغیرہ وغیرہ۔ اب تو خود تیری دنیا سے مجھے آزار ہوتا ہے اور کبھی دوسری درگاہ سے اتنا دل وابستہ ہو چکا ہے کہ یہ تیرے ظلم و جفا کا شکوہ بھی اب کوئی معنی نہیں رکھتا۔

غالب نے یہ غزل غالباً اس وقت کہی ہے جب "زیارت کعبہ" کی خواہش اس کے دل میں شدت سے موجزن تھی اور ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں غزل محض نعتیہ رنگ اختیار کر لیتی ہے جو بالکل پھیکا ہوا کرتا ہے، لیکن غالب نے جس خوبی سے تغزل کو قائم رکھا ہے، اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ اگر آپ مقطع نکال دیں تو یہ واسوخت کے رنگ کی مسلسل غزل ہو جاتی ہے۔

غالب کی ایک اور غزل سنیئے جو تغزل کی تمام خصوصیات کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتی:-

جنوں مستم بہ فصلِ نوبہارم می تواں کشتن صراحی بر کف و گل در کنارم می تواں کشتن

بجرم ایں کہ در مستی بیاباں بردہ ام عمرے بکوئے میفروشاں در خمارم می تواں کشتن

ہجراں زلیتن کہ غرست خونم را دیت نبود چراغ صبح گاہم آشکارم می تواں کشتن

تغافلہائے یارم زندہ دارد ورنہ در ہر دم بجرم گریۂ بے اختیارم می تواں کشتن

منت معذورِ دیدارم لیکن ، اے نامہرباں آخر بدیں جان و دلِ امیدوارم می تواں کشتن

بخونِ من اگر ننگ ست دست و خنجر آلودن نوید وعدہ ! گر انتظارم می تواں کشتن

خدایا از عزیزاں منع شیون کر نتابد جدا از خاکساں دو رانہ دیارم می تواں کشتن

گر فتم یار باشد بے نیاز از کشتنم غالب
بدرد بے نیازیہائے یارم می تواں کشتن

ایک دو غزلیں اور ملاحظہ ہوں :-

نغاں کہ برق عتاب تو آنچنانم سوخت	کہ رازِ دردِ دل و غمزہ اندراتحوانم سوخت
شنیدۂ کہ بآتش نسوخت ابراہیم	ببیں کہ بے شرر و شعلہ می توانم سوخت
مراد میدنِ گل در نگاں نگند ام وقد	کہ باز بر سرِ شاخ گل آشیانم سوخت
نگر پیام عتابی رسیدہ است از دوست	شکستہ رنگی یاران رازدانم سوخت

خبر دہید بقاتل کہ ہجر می کشدم
ز ناہتاب چہ منت برم کتانم سوخت

اے سوج گل نوید تماشائے کیستی	انگارۂ مثال سراپائے کیستی
بیہودۂ نیست سعی صبا در دیار ما	اے بوئے گل پیام تمنائے کیستی
خوں گشتم از تو باغ و بہار کہ بودۂ	کشتی مرا بغمزہ مسیحائے کیستی
نشنیدہ لذتِ تو فرد میرد در بدل	اے حرف محو لعل شکرخائے کیستی
از ہیچ نقشِ غیر نکوئے ندیدۂ	اے دیدہ محو چہرۂ زیبائے کیستی
با ہیچ کا فرانیمہ سختی نمی رود	اے شب برگ من کہ تو فردائے کیستی

غالب نوائے کلک تو دل می برو زدست
تا پردہ سنج شیوۂ انشائے کیستی

بیا و جوشِ تمنائے دیدنم بنگر	چو اشک از سر مژگاں چکیدنم بنگر
زمن بجرم تپیدن کنارہ می کردی	بیا بخاکِ من و آرمیدنم بنگر

شنیدہ ام کہ نہ بینی و نا امیدنیم — ندیدنِ تو شنیدم، شنیدنم بنگر

دمید دانہ و بالید و آشیاں گم شد — بہ انتظارِ ہما دام چیدنم بنگر

اگر ہوائے تماشائے گلستاں داری
بیاد عالمِ در خوں تپیدنم بنگر

غالب —— ولی بادہ خوار

نیاز فتحپوری

غالب کا خیال تھا کہ مسائل تصوف ایک ولی ہی بیان کر سکتا ہے بشرطیکہ آں کہ وہ ولی ہو، اور ولی بادہ خوار نہیں ہو سکتا۔

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالب نے دونوں باتیں غلط کہیں۔ کیونکہ نہ یہ ضروری ہے کہ مسائل تصوف صرف ایک ولی ہی بیان کر سکے اور نہ بادہ خواری کو فقدان ولایت مستلزم ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص ولی نہ ہونے کے باوجود مسائل تصوف بیان کر سکے اور بادہ خوار ہونے کے باوجود ولی ہو۔ کہا جاتا ہے کہ اس شعر کو سن کر غالب کے ایک دوست نے کہا کہ "اگر تم بادہ خوار نہ ہوتے تو ہم تمھیں تب بھی ولی نہ سمجھتے"۔

یہ سن کر غالب نے ظریفانہ انداز میں کہا کہ "تم تو شاید مجھے اب بھی ولی نہ سمجھتے ہو"

بات دراصل یہ ہے کہ غالب نہ ولی تھا نہ اسے تصوف کا کوئی خاص ذوق، بلکہ وہ محض بادہ خوار شاعر تھا جس کا اسے احساس بھی تھا اور یہی چور اس کے دل میں تھا جس نے اس سے "جو نہ بادہ خوار ہوتا" کہلوایا۔ اس کے ذہن میں ولی کا مفہوم صرف یہی نہیں تھا کہ وہ مسائل تصوف بیان کرنے پر قدرت رکھتا ہو، بلکہ اسی کے ساتھ یہ بھی کہ اسے پابند شریعت ہونا چاہئے اور بادہ خواری کو وہ خلاف شریعت سمجھتا تھا۔

غالب کا زمانہ ولیوں کا زمانہ تو نہ تھا، لیکن چونکہ دلی کے جوار میں بہت

سے اولیاء مدفون تھے، ان کے مزاروں پر معتقدین جاتے رہتے تھے۔ علاوہ اس کے یہ زمانہ دلی کی تباہی اور عوام کی مصیبت و پریشانی کا تھا، اس لیے ان مصائب کا مقابلہ کرنے کے لیے تصوف کا سہارا ڈھونڈھا جاتا تھا پھر ہو سکتا ہے کہ ان میں بعض صاحب حال بھی رہے ہوں گے لیکن زیادہ تر صاحب قال تھے اور ان سب کے پاس یہی ایک ذریعہ مایوسیوں کے مقابلہ کا رہ گیا تھا غالب بھی انھیں صاحب قال لوگوں میں تھا میں اسے اسلیئے نہیں کہتا کہ مسائل تصوف سے زیادہ اس نے اپنے دنیاوی مصائب کا ذکر کیا ہے جو اہل دل کا شیوہ نہیں اس زمانے کے شاعروں میں درد البتہ صاحب حال تھے، سو آپ دیکھیں گے کہ اس کے کلام میں غالب کی سی آہ و زاری کا کہیں پتہ نہیں۔

لیکن اس کے باوجود آپ دیکھیں گے کہ غالب نے بہت سے نکات تصوف کا ذکر مختلف انداز بیان سے کیا ہے۔ اس کا سبب ایک تو یہ تھا کہ غالب نے بیدل کا غائر مطالعہ کیا تھا اور کلام بیدل کی اس خصوصیت نے کہ کوئی اسے سمجھے یا نہ سمجھے اس کا اثر ضرور قبول کر لیتا ہے، غالب کو بھی کافی متاثر کیا تھا، دوسرا سبب یہ تھا کہ غالب کے زمانہ میں تصوف نام تھا صرف چند مخصوص الہیاتی نظریوں کا جن میں "وحدت الوجود" کو خاص فلسفیانہ اہمیت حاصل تھی، اس لیے غالب کو اس سے دلچسپی پیدا ہو گئی کیونکہ وہ طبعاً فلسفیانہ دل و دماغ لے کر آیا تھا اور اس طرح اس کا ذوق دقت آفرینی اور دشوار نگاری بھی پورا ہو جاتا تھا۔

لیکن اسکے معنی یہ نہیں کہ اسکے تمام حکیمانہ اشعار بے مغز و بے کیف ہیں، کیونکہ بعض بعض جگہ وہ محض اپنے فکر و تخئیل کی رسائی سے خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچ جاتا ہے۔

ذیل کے اشعار سے اس کے یہ دونوں رنگ بہ آسانی سمجھ میں آ سکتے ہیں۔

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ   طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

کائنات میں ہر جگہ دل ہی دل ہے یعنی معمورۂ دل کے سوا وہ کچھ نہیں اور دل بھی

وہ جو آئینہ کی طرح شفاف و روشن ہے اس لیے انسان کی حالت بیان اس طوطی کی سی ہے جسے ہر طرف آئینہ ہی آئینہ نظر آتا ہے۔ اس آئینہ خانہ میں وہ ہر جگہ اپنا ہی عکس دیکھتی ہے۔

خیال اچھا، الفاظ اچھے اور بظاہر بات بھی اچھی، لیکن تصوف کے گداز کا کہیں پتہ نہیں۔

دردؔ نے بھی کائنات کی اسی معموری کا ذکر کیا ہے لیکن طرزِ بیان و لب و لہجہ سے ایک دنیائے گداز پیش کر دی ہے۔

آہستہ سے چل میانِ کہسار ہر سنگ، دکانِ شیشہ گر ہے

غالبؔ کے یہاں الفاظ ہی الفاظ ہیں کیفیت کا پتہ نہیں، لیکن دردؔ کے یہاں کیف و جذبہ بھی ہے اور بیان کی وہ سادگی بھی جو صداقتِ جذبات کے اظہار کے لیے ضروری ہے۔

۲۔ غالبؔ نے بعض اشعار تصوف کے ایسے سپاٹ لکھے ہیں کہ ان کو غالبؔ سے منسوب کرنے کو بھی نہیں جی چاہتا۔ مثلاً:۔

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے
ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

یہ خیال غالبؔ نے بیدلؔ سے لیا ہے:۔

صورت وہمے بہ ہستی متہم داریم ما چوں حباب آئینہ بر طاق عدم داریم ما

بیدلؔ کے اسی شعر کی تفسیر غالبؔ نے اپنے ان دونوں شعروں میں کی ہے، لیکن بالکل مکتب کے ملاؤں کی طرح ۔ تصوف واقعات کا اظہار نہیں ہے بلکہ مفروضات کو واقعہ

کے رنگ میں پیش کرتا ہے۔ تصوف نام دو اور دو چار کا نہیں، بلکہ اس احتمال کا کہ دو اور دو چار سے کم اور زیادہ بھی ہو سکتے ہیں، سو یہ مقصد دو ٹوک بات کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

۳۔ قریب قریب اسی انداز کا ایک شعر غالب نے اور لکھا ہے۔

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ کہ جب دل میں تمھیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

بالکل قوالی کی سی چیز ہے جو ڈھولک ہی پر اچھی معلوم ہو سکتی ہے۔ اس میں نہ کوئی بیان کی خوبی ہے، نہ معنی کی بلندی۔

۴۔ جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

حق کی تکرار نہ ہو تو شعر بالکل بے لطف ہے، معنی کے لحاظ سے اس میں کوئی ندرت نہیں۔

۵۔ نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

کہا جاتا ہے کہ غالب نے اس شعر میں "وحدتِ وجود" کا صوفیانہ عقیدہ پیش کیا ہے، لیکن نہایت پامال و پیش پا افتادہ انداز سے، جس میں عدم اور خدا دونوں کو ایک ہی سطح پر جمع کر دیا گیا ہے۔

"وحدتِ وجود" کا اصطلاحی مفہوم سادہ زبان میں یہ ہے کہ ہر چیز میں خدا جلوہ گر ہے۔ خیر یہاں تک تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اس میں اس قدر غلو سے کام لینا کہ عدم کو بھی خدا سمجھ لیا جائے، بالکل بے معنی سی بات ہے۔

۶۔ ہر روئے شش جہت در آئینہ باز ہے
اب امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

کیوں نہیں رہا؟ اس کا ثبوت پیش نہیں کیا۔۔۔ آئینہ میں جو چیز جیسی ہے ویسی نظر

نقوش ہے گی، اگر ناقص ہے تو ناقص اور کامل ہے تو کامل۔

۷۔ غالب نے بعض صوفیانہ اشعار ایسے بھی لکھے ہیں جو سپاٹ تو نہیں ہیں، لیکن حسنِ تاویل ان میں نہیں پایا جاتا۔ مثلاً:-

سیاب پشت گرمی آئینہ دے ہے ہاہم
حیراں کئے ہوئے ہیں دلِ بے قرار کے

آئینہ کی پشت پر پارہ پھیلا کر اسے مجلی کیا جاتا ہے۔ یہاں تک تو بات معقول ہے، لیکن دوسرے مصرعہ میں کنایتاً اس کو دلِ بیقرار کہنا بالکل بے محل و خلاف واقعہ ہے، کیونکہ پارہ اسی وقت آئینہ میں انجلاء پیدا کرتا ہے جب اس کی بے قراری ختم ہو جاتی ہے اور پشت آئینہ میں پھیل کر وہ ایک جگہ قائم ہو جاتا ہے۔

۸۔ بہ سلسلۂ تصوف نگاری غالب کے فارسی کلام میں بھی ایسے بے نمک اشعار ملتے ہیں لیکن کم، اور اس کا سبب یہ ہے کہ اگر فارسی اشعار میں کوئی معنوی ندرت نہیں ہوتی تو کم از کم خوبی زبان تو ہوتی ہی ہے اور اس لطف میں معنے کی طرف ہم زیادہ نگاہ نہیں کرتے۔

البتہ جہاں جہاں وہ بیدل کا تتبع کرتا ہے وہاں بیشک ساری قلعی کھل جاتی ہے اور محض "طبل بلند بانگ" ہو کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً:-

دیدہ ور آنکہ تا نہد دل بہ شمارِ دلبری   در دلِ سنگ بنگرد رقصِ بتانِ آذری

دوسرا مصرع محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے اور اس کی کوئی دلیل پیش نہیں کی۔

اسی زمین کا دوسرا شعر ہے:-

رنگ ملک چہ دیدہ‌ای چو بتو رہ نمی برد   بیہدہ بدہوا ئے تو ہمی پرواز یک سری

یہ شعر نہ برا ہے نہ اچھا۔ لیکن اسی زمین میں جب وہ تقلید و تتبع سے ہٹ کر سامنے آتا ہے تو اس کا رنگ کچھ اور ہوتا ہے مثلاً"

اے تو کہ ہیچ ذرہ را جز بہ رہِ تو روئے نیست   در طلبت تواں گرفت بادیہ را بہ رہبری

یعنی کیوں نہ تیری جستجو میں اپنا رہبر میں بیابان کو قرار دوں جس کے ہر ہر ذرہ کا رخ تیری ہی طرف ہے، اس کے بعد کے شعر میں وہ بالکل بے لاگ کھلا ہوا غالب نظر آتا ہے اور اس کی انفرادیت پر قربان ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔

ہر کہ دلے ست در برش داغ تو در دمیدش بدل   تا چہ بدیگرے دہد یا نہ بری بدا دری

یعنی کوئی ایسا نہیں جس کے پہلو میں دل ہو اور اس دل میں تیری محبت کا داغ یا نشان نہ پایا جائے، اس لیے تیرے سوا اگر کسی اور کو دل دے بھی دیا جائے تو بیکار ہے کیونکہ تو اپنے نشان ملکیت کی بنا پر فوراً زبردستی اسے واپس لے سکتا ہے۔ اس غزل کے مقطع میں بھی غالب نے اپنی انفرادیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

بینی ام از گداز دل در جگر آتشے چو سیل
غالب اگر دمِ سخن رہ بہ ضمیر من بری

یعنی اگر تو میرے ضمیر، میرے دل کی گہرائی تک پہونچ سکتا ہے تو دیکھ کہ میرا کیا عالم ہے، آگ کا ایک سیلاب ہے جو دل و جگر میں موجیں مار رہا ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی ظاہر کیا غالب کے اردو کلام میں بعض اشعار تصوف کے بہت سپاٹ ہیں اور یقیناً قابل اعتنا نہیں لیکن میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اس کے بعض اشعار جو سطحی نہیں ہیں، وہ بھی لطف و کیفیت سے معرا ہیں۔

ذیل کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:-

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا   کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا
میں عدم سے پرے ہوں ورنہ غافل بارہا   میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا
مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی   ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا — جادہ، اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا — بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا — گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

یک ذرۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا — یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالہ کے داغ کا

یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز — چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

غرق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز — ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ — برنگِ خار مرے آئینہ سے جوہر کھینچ

فنا تعلیمِ درسِ بیخودی ہے اس زمانہ سے — کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

نہیں اقلیمِ الفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا — کہ پشتِ چشم سے جس کے نہ ہووے مہر عنواں پر

برنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بیتابی — ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم — لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے — برقِ خرمنِ راحت، خونِ گرمِ دہقاں ہے

ہم سے رنجِ بیتابی کس طرح اٹھایا جائے — داغ پشتِ دستِ عجز، شعلہ خس بدنداں ہے

یہ تمام اشعار وہ ہیں، جنھیں تمام مفسرین و شارحین مطالبِ تصوف و فلسفہ کا حامل قرار دیتے ہیں، لیکن انتہائی کوشش کے بعد بھی جو مفہوم ہاتھ آتا ہے وہ مفروضات موہومہ کے سوا کچھ نہیں۔ ان کی حیثیت بالکل ہے A ہے Z ہے Z1 کی سی ہے۔ جس کا مقصود صرف جوڑ بٹھانا ہوتا ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ان سے دماغی ورزش تو ضرور ہو جاتی ہے لیکن ذہنی تفریح یا احساس حقیقت سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ محض الفاظ کی گرہیں ہیں کہ اگر آپ انھیں کھولنے میں کامیاب ہو جائیں تو بھی ان میں شکن بدستور باقی رہتی ہے۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ بعض مسائل تصوف اپنے اندر کافی کشش رکھتے ہیں اور وہ دماغ کو فکر و تصور کے بڑی دلکش بلندی تک لے جاتے ہیں، لیکن صرف اسی صورت میں کہ ان خیالات کا VEHICLE کوئی اسی دنیا کی چیز ہو، یعنی مجاز سے گزر کر حقیقت کی طرف پہونچا جائے، لیکن غالب کے ان اشعار میں مجاز سے بالکل ہٹ کر، براہ راست حقیقت تک پہونچنے کی جو کوشش کی گئی ہے وہ بازیگری اور ACROBATISM تو یقیناً ہے لیکن کیف کا دور دور پتہ نہیں۔ حیرت ہے کہ غالب نے ایک جگہ خود بھی اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ:

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

لیکن ان اشعار میں انھوں نے اس اصول کو ترک کر دیا۔ البتہ جہاں جہاں انھوں نے اس کی پابندی کی ہے اور عامۃ الورود واقعات و احساسات عامہ کی وساطت سے ان مسائل کو پیش کیا ہے وہاں نکھار بھی پیدا کیا گیا ہے اور کیفیت تصدیق و یقین بھی، مثلاً:

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

اس شعر کا پہلا مصرع کچھ نہ تھا، لیکن دوسرے مصرع نے اسے سب کچھ بنا دیا۔

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے بھرے ہیں جسقدر جام و سبو میخانہ خالی ہے
محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
حریف جوشش دریا نہیں خودداری ساحل جہاں ساقی ہو تو دعویٰ ہے باطل ہوشیاری کا
ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

یعنی یوں تو ہم بہت سے بت یا حجابات توڑ چکے ہیں، لیکن خود ہماری ذات یا انا سب سے بڑا سنگ گراں ابھی تک موجود ہے، اور اس لیے اصل بت شکنی دراصل

نام ہے "خودشکنی" کا اور یہ آسان نہیں۔

خیال، زبان و اندازِ بیان کے لحاظ سے یہ شعر بیانِ تصوف میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ چند اشعار اور ملاحظہ ہوں۔

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیم روز آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ان اشعار میں اکثر ایسے ہیں جنھیں ہم مجازی شاعری نہیں کہہ سکتے۔ لیکن چونکہ ان کی زبان، ان کا لب و لہجہ وہی ہے جو مجازی شاعری میں بھی ہماری نظر سے گزرتا رہتا ہے، اس لیے ہم ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لیکن اس سلسلہ میں پھر غالب کی وہی کہی ہوئی بات سامنے آجاتی ہے کہ "فارسی بیں تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ" اور اس میں شک نہیں اس نقشہائے رنگ رنگ میں اس کا نقشِ تصوف بھی بڑا دلکش بڑا جمیل اور بہ عظیم نظر آتا ہے۔

کلیات میں پہلا شعر حمد ہی کا ملاحظہ فرمائیے۔

اے بہ خلا و ملا خوئے تو ہنگامہ زا با ہمہ در گفتگو بے ہمہ در ماجرا

تمام دوسرے صوفی شعرا کی طرح غالب نے بھی اس میں خدا کی "وحدت وجود" ہی کا ذکر کیا ہے لیکن الفاظ کے انتخاب، ان کی نشست، لب و لہجہ کی متانت، اور اسی کے ساتھ آفاقی قسم کے تنزیہی آہنگ نے خدا کی شوکت و جبروت اور عظمت و جلال کا اظہار جس انداز سے کیا ہے اس کی نظیر مشکل ہی سے دوسری مل سکتی ہے۔

یہ غزل پوری کی پوری اسی رنگ کی ہے اور اس کا ہر شعر اسی خیال کا ترجمی

ارتقاء ہے۔ گویا غالب "فضائے قدس" کو متحیرانہ دیکھ رہا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ وہ کیا کہے اور کیونکر اپنے صحیح تاثرات کا اظہار کرے، ایک جوش ہے جو کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتا، ایک سیلاب ہے جو برابر بڑھتا ہی جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

آب نہ بخشی بزور، خونِ سکندر ہدر جاں نہ پذیری بہیچ نقدِ خضر نارَوا

آبِ حیات کی جستجو میں سکندر کی ناکامی اور خضر کی حیاتِ دوام مشہور روایات ہیں اور تمام شعراء نے ان تلمیحات کا استعمال مختلف انداز میں کیا ہے۔ لیکن غالب نے حمد کے سلسلہ میں جس رخ سے ان کا ذکر کیا ہے، وہ غالب ہی کا حصّہ تھا۔ کہتا ہے کہ تیری شانِ بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ آبِ حیات کی طلب میں سکندر کا خون بھی تیرے یہاں حلال ہے اور خضر کی طرف سے جان ایسی عزیز پیش کش بھی تجھے منظور نہیں۔

اسی خیال کا اعادہ زیادہ شاعرانہ انداز میں ملاحظہ فرمایئے:-

بزم ترا شمع و گل خستگیِ بوتراب ساز ترا زیر و بم واقعۂ کربلا

تیری بے نیازی کا یہ رنگ ہے کہ بوتراب (حضرت علیؑ) کی خستگی و ناکامی اور حسینؑ کی سرگزشت خونیں بھی گویا بزم بے نیازی کی رونق ہے اور تیرے ساز استغنا کا آہنگ زیر و بم ۔۔۔!

تصورِ احدیت کے لیے موجودات کی کشمکش کی طرف سے آنکھ بند کر لینا، صوفیہ کے یہاں ضروری ہے۔ چنانچہ رومیؔ کہتے ہیں۔

لب ببند و گوش بند و چشم بند

غالب اسی خیال کو بیدل کی زبان میں اس طرح ظاہر کرتا ہے۔

خطے بہ ہستیِ عالم کشیدیم از مژہ بستن ز خود رفتیم و ہم با خویشتن بُردیم دنیا را

ایک جگہ جستجوئے حق کی سرگرمی میں غالب اپنی ناکامی کا ذکر اس طرح کرتا ہے۔

رہرو تشنۂ در رفتہ بہ آبم غالب توشہ بر لب جو ماندہ نشان ست مرا

تصور کیجئے کہ ایک مسافر شدید گرمی کے زمانہ میں کسی دریا کے کنارے پہونچ جاتا ہے اور انتہائی تشنگی کے عالم میں اپنا تمام زادِ راہ وہیں ساحل پر چھوڑ کر پانی کے اندر کود پڑتا ہے اور پھر نہیں ابھرتا، لوگ آکر اس کے زادِ راہ یا توشہ کو دیکھتے ہیں اور ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ وہ بدنصیب کون ہے جو دریا کے کنارے اپنا سارا سامان چھوڑ کر غائب ہو گیا ہے اور پھر موجوں کے تلاطم کو دیکھ کر سمجھ جاتے ہیں کہ حقیقت کیا ہے اور وہاں سے گزر جاتے ہیں۔

غالب کہتا ہے کہ میرا حال بھی اسی بدنصیب مسافر کا سا ہے جو خود تو پانی میں ڈوب مرا ہے لیکن توشہ کی صورت میں اپنا نشان چھوڑ گیا ہے اور کسی کو خبر نہیں کہ وہ ڈوب جانے والا کون تھا۔

یہ شعر غالب کے ان چند اشعار میں سے ہے جن کو میں یکسر الہامی کہتا ہوں اور جس کی مثال فارسی کے بڑے بڑے شعراء کے کلام میں بھی ہم کو مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ آتش نے غالب کے اسی خیال سے متاثر ہو کر یہ شعر کہا تھا۔

میں اس جہان میں وہ چوب خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ جسے کارواں روانہ ہوا

اس رنگ سے ہٹ کر دوسرے رنگ میں غالب کے چند اشعار تصوف

ملاحظہ ہوں:۔

آں راز کہ در سینہ نہاں ست نہ وعظ ست — بردار تواں گفت بہ منبر نہ تواں گفت

بڑا لطیف اشارہ ہے منصور کے دعوائے انا الحق کی طرف

ہم از احاطۂ تست اینکہ در جہاں ما را — قدم بہ بتکدہ و سر بر آستانۂ تست

یہ شعر بھی وحدت وجود کا ہے اور اس خیال کو غالب نے بڑے لطیف انداز سے پیش کیا ہے، کہتا ہے کہ ہر چند میرا قدم بتکدہ میں ہے لیکن سر تیرے ہی آستانہ پر جھکا ہوا ہے، کیونکہ تو تمام عالم پر محیط ہے اور وہ کعبہ ہو یا بت خانہ، تیرے ہی جلوہ سے معمور ہے۔

اسی خیال کو وہ دوسری جگہ ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے۔

مقصود ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست — ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں اسد

گر فراموشی بہ فریادم رسد وقت ست وقت — رفتہ ام از خویشتن چندانکہ در یادِ خودم

یعنی میں اپنے آپ سے تو گزر گیا ہوں، لیکن ابھی تک اپنے آپ کو بھولا نہیں اس لیے چاہتا ہوں کہ فراموشی کامل مجھ پر طاری ہو جائے میں اپنے آپ کو بھی بھلا دوں۔

اسی خیال کو وہ اس سے زیادہ لطیف انداز میں یوں ظاہر کرتا ہے:۔

ہر قدم یکتے ز خود رفتن بود در بار من — ہمچو شمع بزم در راہِ فنا زادِ خودم

یعنی جس طرح شمع آہستہ آہستہ پگھل کر فنا ہو جاتی ہے اور اس کے پگھلنے کا سبب بھی وہ خود آپ ہے، اسی طرح میں بھی ہر قدم پر اپنے آپ سے دور ہوتا جا رہا ہوں۔

چند غزلیں غالبؔ نے ایسی بھی لکھی ہیں، جن کے اکثر اشعار ایک ہی موضوع سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسی غزلوں میں دو ایک تحو کی بھی ہیں مثلاً:-

چوں زباں ہا لال و جاں ہا پر ز غوغا کردہ ای   بایدت از خویش پرسید آنچہ با ما کردہ ای

یہ خود اپنے ہی سے پوچھ کہ یہ تو نے کیا کر دیا ہے کہ زبان تو میری گنگ ہے اور دل و جان ہنگامۂ شوق سے لبریز ہیں۔

گر نہ ای مشتاقِ عرضِ دستگاہِ حسنِ خویش   جاں فدایت دیدہ را بہر چہ بینا کردہ ای

تو اگر اس کا مشتاق نہیں کہ دنیا تیرے متاعِ حسن کو دیکھے، تو پھر تو نے آنکھوں کو دیکھنے کی قوت ہی کیوں عطا کی۔

بعض اشعار جو زیادہ سہل ہیں ملاحظہ ہوں:-

صد کشاد آں را کہ ہم امروز رخ بنمودہ ای   مژدہ باد آں را کہ محوِ ذوقِ فردا کردہ ای
خستگاں را دل بہ پرسشہائے پنہاں بردہ ای   بادرستاں گر نوازشہائے پیدا کردہ ای
ذرہ را زر و شناس صد بیاباں گفتہ ای   قطرہ را آشنائے ہفت دریا کردہ ای
دجلہ می جوشد ہمانا دیدہ را جویائے تست   شعلہ می بالد مگر در سینہ ما جا کردہ ای
جلوہ و نظارہ پنداری کہ از یک گوہر ست   خویش را در پردۂ خلقے تماشا کردہ ای
صد کشاد آں را کہ ہم امروز رخ بنمودہ ای   مژدہ باد آں را کہ محوِ ذوقِ فردا کردہ ای

اسی زمین میں ایک شعر خاص اس کے ذوق کا دیکھئے۔

چشمۂ نوش ست از زہرِ عتابت کام جاں   تلخی مے در مذاقِ ما گوارا کردہ ای

یعنی تو نے چشمۂ نوش میں زہرِ عتاب اسی لیے ملا دیا ہے کہ تو جانتا ہے میں شراب میں تلخی کا دلدادہ ہوں۔

ایک اور شعر نہایت ذہن حسنِ تعلیل کا ملاحظہ ہو۔

ہفت دوزخ در نہادِ شرمساری مضمر ست   انتقام است ایں کہ با مجرم مدارا کردہ ای

مجرم دگنا ہگار کے ساتھ تیرا برتاؤ اور اصل بڑا انتقام ہے کیونکہ اس طرح مجرم بے انتہا شرمسار ہوگا اور شرمساری بجائے خود بڑا عذاب ہے۔

غالب کی ایک اور مسلسل غزل ہے جو بہ لحاظ جذبات و انداز بیان ایک خاص والہانہ کیفیت اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں جو حقیقت بھی ہیں اور مجاز بھی :۔

اے موج گل نوید تماشائے کیستی انگارۂ خلال سراپائے کیستی
بیہودہ نیست سعی صبا در دیار ما اے بوئے گل پیام تمنائے کیستی
خون گشتم از تو باغ و بہار کہ بودۂ کشتی مرا بہ غمزہ مسیحائے کیستی
نشنیدہ لذت تو فزودیم درد بدل اے حرف مجو لعل شکر خائے کیستی

ایک رُباعی میں وہ منصورؒ کے دعوائے انا الحق و ہمہ اوست کی تائید اپنے خاص انداز بیان میں اس طرح کرتا ہے :۔

منصور غمش ز نکتہ چینان چہ بود در راست خطر ز ہم نشینان چہ بود
چون راقبت یگانہ بینان دارست دریاب کہ انجام دو بینان چہ بود

یعنی جب خدا کو یگانہ دیکھنے والوں کا انجام دار ہے تو معلوم نہیں ان کا انجام کیا ہوگا جو دوئی کے قائل ہیں۔

اس اقتباس سے آپ کو بہ آسانی معلوم ہو سکے گا کہ غالب کی متصوفانہ یا فلسفیانہ شاعری میں کوئی خاص بات ایسی نہیں جسے ہم واقعی کسی اہل دل یا اہل حال کے تاثرات کا نتیجہ کہہ سکیں۔ اُس کا تصوف و فلسفہ ایک مستعار چیز تھا اور غالب نے اسے غالباً اس لیے اختیار کیا تھا کہ وہ بقولِ حریفؔ "برائے شعر گفتن خوب ست" یا یہ کہ

اس زمانہ کے محافلِ شعر و سخن میں اس چیز کی مانگ تھی اور غالب کے لیے ضروری تھا کہ ان مجالس میں درخور پانے کے لیے وہ اس رنگ کے اشعار بھی کہے۔

غالب کا اصل فن اس کی شوخ نگاری تھی، اس کی غیر معمولی رسائی ذہن تھی، انداز بیان کی ندرت تھی اور اس کی شاعری کی یہ خصوصیات اس کے ہر صنفِ سخن میں پائی جاتی ہیں۔

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں مزید اس طرح کی شان دار، مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884

سدرہ طاہر : 03340120123

حسنین سیالوی : 03056406067

غالب کا نہانخانۂ ازل

(نیاز فتحپوری)

غالب نے ایک قطعہ میں ازراہ افتخار ظاہر کیا ہے کہ اگر پچھلے شاعروں میں سے کسی کے شعر میں وہی مضمون پایا جائے جو میں نے لکھا ہے تو

سبرگمانِ توارُد یقیں شناس کہ دزد
متاعِ من زنہانخانۂ ازل بردست

یعنی اسے توارد نہ سمجھو بلکہ اسے یوں سمجھو کہ وہ دراصل میرا ہی مضمون تھا جو نہانخانۂ ازل میں، میں نے محفوظ کر دیا تھا اور چور نے اسے اڑا لیا۔

غالب نے یہ قطعہ کیوں کہا؟ — ظاہر ہے کہ اس کا سبب صرف یہی ہو سکتا تھا کہ کسی نے اُن پر سرقہ یا توارُد کا الزام لگایا ہو اور انھوں نے جھنجھلا کر یہ قطعہ لکھا ہو۔

غالب کے متعلق یہ خیال کہ وہ کسی اور کے شعر سے سرقہ کر سکتا تھا، یقیناً کوئی معنی نہیں رکھتا، کیونکہ اس کے ہزاروں اشعار میں سے جو اپنی جگہ بڑی قیمت رکھتے ہیں، اگر دس بیس اشعار ایسے مل بھی جائیں جن کا مضمون قدماء کے اشعار سے ملتا جلتا ہے تو اسے سرقہ نہیں کہہ سکتے۔ زیادہ سے زیادہ توارد کہہ سکتے ہیں۔ لیکن غالب توارد کی نسبت بھی گوارا نہیں کرتا اور کافی خشونت کے ساتھ وہ اس خیال کی تردید اس طرح کرتا ہے کہ اگر توارد ہوا بھی ہے تو اس کا ترکیب میں نہیں ہوں، بلکہ وہی شاعر ہے جو مجھ سے پہلے ہوا، میرے مضامین کو "نہانخانۂ ازل" سے چرا لایا تھا۔

یقیناً غالب نے اس کہنے میں انصاف سے کام نہیں لیا اور نہ یہ کوئی معقول

بات ہے کسی بات کو محض شوخی و تفنن سے "مالدینا معترض کو خاموش نہیں کر سکتا۔ اگر کسی نے اعتراض سرقہ توارد کا قایم کیا تھا، تو یہ محض شاعری تو نہ تھی بلکہ ایک ایسے خیال کا اظہار تھا جسے وہ صحیح سمجھتا تھا۔ لیکن اس کے جواب میں غالب نے صرف شاعری سے کام لیا۔ حالانکہ وہ نہایت آسانی سے کہہ سکتا تھا کہ سرقہ و توارد میں بڑا فرق ہے۔ اور جس بات کو تم سرقہ کہتے ہو وہ محض توارد ہے جو شعراء کے یہاں پایا جاتا ہے اور ہمیشہ پایا جائے گا۔ کیونکہ جذبات کی دنیا میں بنیادی تاثرات ہمیشہ ایک ہی سے ہوتے ہیں۔ فرق پیدا ہوتا ہے صرف انداز بیان سے، لب ولہجہ سے، اور ان میں اشتراک مستبعد نہیں۔

معلوم ہوتا ہے غالب کے زمانہ میں بھی سرقہ و توارد کا سوال کبھی کبھی سامنے آجاتا تھا اور ایک دوسرے پر نکتہ چینی کے سلسلہ میں یہ الزام قایم کیا جاتا تھا، چنانچہ خود اس نے ایک قطعہ میں بھی اس کا اظہار کیا ہے کہ شعر کوئی "چک یا ٹنک" تو ہے نہیں کہ جس پر کسی کا نام درج ہو، نام و نشان یا مہر ثبت ہو، اس کا چرانا کیا مشکل ہے۔

مضمون شعر نوشت بود در زمانہ ۔۔۔ یعنی بدست ہر کہ بیفتاد آن اوست

ہو سکتا ہے کہ غالب کو خود بھی شکایت ہو کہ لوگ اس کے مضامین اڑا لیتے ہیں اور اسی بات کو اس نے طنزیہ انداز میں اس طرح ظاہر کیا ہو۔

شاعروں کی جماعت ایک طرح کی پیشہ ور جماعت ہے اور پیشہ میں رشک و رقابت ہمیشہ سے چلی آئی ہے۔ پہلے بھی جب کوئی شاعر ابھرتا ہوا نظر آتا تھا تو اس کی تخفیف کے لیے اس پر سرقہ کے الزامات عاید کیے جاتے تھے جو صحیح بھی ہوتے تھے اور غلط بھی۔ لیکن چوری پکڑنا آسان نہ تھا، اس کی جراءت وہی کر سکتا تھا جس کا مطالعہ بہت وسیع ہو، تمام مشاہیر شعراء کا کلام اسکے پیش نظر

ہو اور وہ ثبوت میں برمحل اسے پیش کر سکتا ہو۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ملا شیدا اور ملا فیروز کی نوک جھونک کا ایک نہایت دلچسپ واقعہ ملاحظہ ہو۔

ملا شیدا، اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد کا شاعر تھا اور بڑا ذہین شاعر تھا، اس کا عروج دیکھ کر اس کے ہم چشموں میں جذبۂ رشک و حسد پیدا ہوا اور انھوں نے طے کیا کہ اسے کسی نہ کسی طرح ذلیل کیا جائے۔ اس کے لیے انھوں نے یہ تدبیر سوچی کہ کسی محفل میں ملا شیدا سے شعر پڑھنے کی خواہش کی جائے اور اس کے ہر شعر کو سرقہ ثابت کر کے اسے رسوا کیا جائے۔ یہ خدمت ملا فیروز کے سپرد کی گئی کیونکہ وہ قوت حافظہ اور وسعت مطالعہ میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا، چنانچہ ایک دن یہ محفل منعقد ہوئی اور لوگوں نے ملا شیدا سے درخواست کی کہ وہ اپنا کلام سنائے۔

اس نے اپنا ایک شعر پڑھا جو آج بھی بہت مشہور ہے۔

چیست میدانی ؟ مئے گلگوں مصفا جوہرے	حسن را پروردگارے عشق را پیغمبرے

ملا فیروز نے کہا شعر خوب ہے، لیکن رودکی اس سے بہت پہلے کہہ چکا ہے۔

عشق را پیمبر و لیکن حسن را آفریدگار توئی

شیدا نے دوسرا شعر پڑھا۔

زبسکہ کردہ عفونت نہ در جگر ناخن	چو پشت ماہیم از پائے تا بسر ناخن

(اس میں مچھلی کے فلس کو ناخن سے تشبیہ دی ہے۔)

ملا فیروز نے کہا یہ مضمون آپ کا نہیں عنایت اے حلوائی کا ہے۔ کہتا ہے:-

زبسکہ سینہ کندم و ناخن براں نشست	چوں پشت ماہی ست سراپائے سینہ ام

ملا شیدا نے جھنجھلا کر تیسرا شعر پڑھا۔

گریہ صحرا مو فشانی دشت پر سنبل شود	در بدریا رو بشوئی خار ماہی گل شود

ملا فیروز نے کہا کہ یہ مضمون تو کاتبی کا ہے۔

گر بدریا افتد از عکس جمال او فروغ خار ماہی را رود در قعر دریا پا بہ گل

اس کے بعد شیدا نے یہ شعر سنایا۔

ذات تو بود صحیفۂ کون کہ کرد از روئے ادب مہر خدا بر پشتت

اور فیروز نے جواب میں ہاتفی کا یہ شعر سنا دیا۔

نبوت را توئی آں نامہ در مشت کہ از تعظیمت آمد مہر بر پشت

پھر شیدا نے ایک اور شعر سنایا۔

زلف او در رشتۂ جاں گفتم و گشتم خجل زانکہ ایں معنی چو زلفش پیش پا افتادہ است

فیروز نے کہا یہ بات آپ سے پہلے ہاتفی کہہ چکا ہے۔

کس نیارد مصرعۂ پیچیدۂ زلف بحث لیک ایں مضموں ترا در پیش پا افتادہ است

اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قسم کی نوک جھونک، پہلے بھی ہوتی تھی ——
اس لیے اگر غالب کے عہد میں بھی اس طرح کی باہمی چشمک پائی جاتی تھی، تو جائے عجب نہیں۔ لیکن غالب نے جس طنزیہ انداز سے ان الزامات کا جواب دیا ہے وہ اطمینان بخش نہیں ہے۔

اگر غالب کے یہاں توارد پایا جاتا ہے تو یہ کوئی عیب نہ تھا کہ اس سے انکار کیا جاتا، بلکہ شعراء متقدمین کے کلام سے اس کے جواز کو ثابت کیا جا سکتا تھا، لیکن چونکہ غالب نے اساتذۂ قدیم کے کلام کا مطالعہ بہت کم کیا تھا (اور غالباً اسی نے اس کو تقلید و تتبع سے باز رکھ کر اس کی انفرادیت علٰحدہ قائم کی۔) اس لیے وہ ملا فیروز کی طرح کوئی جواب نہ دے سکا اور طنزیہ جواب دے کر خاموش ہو گیا۔

جیسا کہ میں نے ابھی ظاہر کیا غالب کا مطالعہ محدود تھا اور صرف چند

مشہور شعراء (بیدل، عرفی، نظیری، حزین، ظہوری وغیرہ) کا کلام اس نے دیکھا تھا۔ اور وہ بھی جستہ جستہ، اس لیے جو نقوش اس کے ذہن میں مرتسم ہوئے وہ بھی محدود تھے اور اسی لیے اس کے کلام میں ہم کو توارد کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

بیدل کا مطالعہ بیشک اس نے اول اول زیادہ کیا تھا، اور اس کی پیروی بھی اس نے کرنا چاہی جس کو وہ بقول خود نباہ نہ سکا، اس لیے اس کے کلام میں ہم کو بیدل ضرور چھپا ہوا نظر آتا ہے، کہیں کم کہیں زیادہ، چنانچہ اس کے اردو دیوان کا بڑا حصہ مولانا خیر آبادی نے اسی لیے حذف کر دیا کہ وہ بیدل کا ناقص تتبع تھا اور اس کے بعد بھی جو حصہ رہ گیا وہ ناگوار اشکال پسندی سے یکسر خالی نہ تھا۔ مثلاً

بیدل	غالب
در طینت نفسرده صفا یا کدورت ست	صفائے حیرت آئینہ ہے سامان زنگ آخر
آئینہ می کشند بہ زنگار آب را	تغیر آب برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر

دونوں شعروں کا مفہوم ایک ہی ہے۔

بیدل

منزل عیش تو وحشت کدۂ امکاں نیست — چمن از سایۂ گل پشت پلنگ ست اینجا
در وحشت ایں بزم بہ عشرت نتواں زیست — ہر چند چراغانش کنی پشت پلنگ است

غالب

نہ کی سامان عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی — ہوا داغ زمرد بھی مجھے داغ پلنگ آخر

مضمون ایک ہے۔ فرق یہ ہے کہ بیدل نے سایۂ گل کو پشت پلنگ (چیتا) کہا اور غالب نے داغ زمرد کو

بیدل: بہ آنجا جواب نامۂ عاشق تغافل ست — بیہودہ انتظار خبری کشیم ما

غالب

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

دونوں شعروں کا مفہوم یہی ہے کہ جواب خط کا انتظار بیکار ہے۔ کیونکہ وہ جواب لکھیں ہی گے نہیں۔

بیدل غالب

چشم واکردن کفیل فرصت نظارہ نیست تا کجا اے آگہی رنگ تماشا باختن
پرتو ایں شمع آغوشِ وداعِ محفل ست چشم واگر دیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

چشم وا کو دونوں نے آغوش وداع ظاہر کیا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ بیدل نے اس کو محفل سے متعلق کیا اور غالب نے جلوہ سے۔

غالب و بیدل میں کہیں کہیں توارد و ہم آہنگی پائے جانے کا سبب صرف یہ ہے کہ اول اول غالب، بیدل سے بہت متاثر تھا اور بیدل کی بہت سی ترکیبیں غالب کے تحت شعور میں مرتسم ہو گئی تھیں اور بغیر قصد وہ قلم سے نکل جاتی تھیں۔

اسی طرح بعض دوسرے شعراء کے خیال کا توارد بھی غالب کے یہاں پایا جاتا ہے، مثلاً:-

خاقانی کا شعر ہے:-

زیں نام چو تر کنم زباں را صد بوسہ دہد لبم زباں را

غالب نے اس خیال کو اس طرح نظم کیا ہے۔

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

عنائی استرآبادی کا شعر ہے:-

قامت ز رشک بیش کسے چوں نمی برم آیا مراغ از کہ کنم منزل را

غالب کہتا ہے۔

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

بیگم دختر امیر علی جلائر کا ایک بڑا پاکیزہ شعر ہے۔

من اگر توبہ زمے کردہ ام اے سرو سہی
تو خود ایں توبہ نکردی کہ مرا مے ندہی

غالب نے اسی خیال کو اس طرح نظم کیا۔

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

خسرو کا شعر ہے:۔

زہے عمرِ درازِ عاشقاں گر
شبِ ہجراں حساب عمر گیرند

غالب نے بالکل اسی خیال کو اس طرح نظم کیا ہے۔

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

غالب کا بڑا مشہور شعر ہے:۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

حالانکہ خسرو بہت پہلے یہ خیال اس طرح ظاہر کر چکا تھا۔

اے گل چہ آمدی ز زمیں گو چگونہ اند
آں روہا کہ در تہِ گردِ فنا شدند

غالب کا شعر ہے۔

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

عالی شیرازی کہتا ہے

آب و رنگ گلستان عشق اکنوں از من ست
عندلیباں ہر چہ می گویند مضموں از من ست

نظیری کا شعر ہے۔

راز دیرینہ ز رخ پردہ بر انداخت دریغ
عالمِ من شہرہ بہ انشاد غزل کرد دریغ

غالب نے اس خیال کو یوں نظم کیا ہے:۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

دونوں شعروں کا خیال ایک ہی ہے۔

تلاش سے اور بھی اشعار غالب کے یہاں ایسے مل سکتے ہیں جو دوسرے شعراء کے کلام سے متوارد ہوں، لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں جو غالب کی دون مرتبت ہو اور وہ معذرت میں "نہاں خانۂ ازل" کی داستان چھیڑ دے۔

غالب کی مثنوی نگاری

(نیاز فتحپوری)

سرمۂ بینش غالب کی یہ پہلی مثنوی سراج الدین بہادر شاہ کی مدح میں ہے لیکن ہے وہ متصوفانہ، جس میں بہ تتبع شعرائے متصوفین حسن و عشق کے پس منظر میں وحدۃ الوجود اور تہذیب اخلاق کے کچھ دھندلے نقوش پیش کئے گئے ہیں:-

...... مدح بادشاہ سے بھی کوئی زیادہ تعلق نہیں، انداز بیان تو بیشک اس کا وہی ہے جو اس کے یہاں ہر صنف سخن میں پایا جاتا ہے، لیکن ندرت خیال و پختگی فکر کے لحاظ سے چنداں قابل لحاظ نہیں۔

درد و داغ دوسری مثنوی کا نام "درد و داغ" ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ اصل چیز تقدیر ہے۔ لاکھ کوشش کی جائے نوشتۂ قسمت مٹ نہیں سکتا۔ اس نظریہ کو انھوں نے ایک حکایت کے ذریعہ سے ذہن نشین کرانا چاہا ہے۔ اس مثنوی کی غایت تو بلند نہیں، وہی فرسودہ سی بات ہے جسے شعرائے متصوفین نے بار بار دہرایا ہے۔ لیکن شاعرانہ نقطۂ نظر سے اس میں بعض بڑی لطیف و دلکش تعبیرات نظر آتی ہیں۔

قصہ یہ ہے کہ ایک نہایت خستہ حال خاندان جو ماں، باپ اور بیٹے، تین افراد پر مشتمل ہے، زندگی کی صعوبتوں سے تنگ آکر جنگل کی طرف نکل جاتا ہے وہاں انھیں ایک درویش مل جاتا ہے جو ان کے حال پر رحم کھا کر خدا سے ان کے حق میں دعا کرتا ہے خدا کی طرف سے جواب ملتا ہے کہ سیئت و ذلت

ان کے لیے معصوم ہو چکی ہے، دعا بیکار ہے، درویش مکرر عرض کرتا ہے اور خدا اس پر راضی ہو جاتا ہے کہ اچھا ان کی ایک ایک دعا قبول کر لی جائے گی یہ سن کر عورت جو بہت ضعیف ہو چکی تھی، از سرِ نو اعادۂ شباب کی دعا مانگتی ہے اور وہ قبول ہو جاتی ہے، لیکن ٹھیک اسی وقت جب وہ پیکرِ حسن و جمال بن جاتی ہے، ایک نوجوان شاہزادہ اس طرف سے گزرتا ہے اور دونوں ایک دوسرے پر مائل ہو جاتے ہیں۔ شاہزادہ اسے گھوڑے پر بٹھا کر لے جاتا ہے۔ اس کا ضعیف شوہر یہ ماجرا دیکھ کر سخت دلگیر ہوتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ اے خدا، اس بدکار عورت کو تو خنزیر (سور) بنا دے۔ اس کی بھی یہ دعا قبول ہو جاتی ہے، اور جب شاہزادہ دفعتاً یہ دیکھتا ہے کہ اس کے ساتھ گھوڑے پر عورت نہیں بلکہ سور یا سوار ہے تو وہ اسے زمین پر گرا کر اپنی راہ لیتا ہے۔ لڑکا جب یہ دیکھتا ہے تو اسے اپنی ماں پر بڑا رحم آتا ہے اور وہ دعا کرتا ہے کہ "خدایا، تو پھر اسے اپنی اصلی حالت پر واپس لے آ" اور وہ پھر بڑھیا ہو جاتی ہے ـــ مدعا اس حکایت سے یہ ظاہر کرنا ہے کہ گو خدا نے ان سب کی دعا قبول کر لی، لیکن ان کی بدقسمتی نے ساتھ نہ چھوڑا اور جیسے تھے ویسے ہی رہے۔

حکایت میں قطعی کوئی جدت نہیں، مثنوی رومی میں بھی اکثر جگہ اس قسم کی حکایتیں نظر آتی ہیں، لیکن شاعرانہ نقطۂ نظر سے یقیناً نوادر سے خالی نہیں۔

مثلاً اس خاندان کی زبوں حالی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

دست تہی آئینۂ قسمتش　　زخمِ دل و داغِ جگر دولتش

مایۂ او، داغ نہ ہماں در برش　　پیرہنش از جگرش چاک تر

اس کے بعد اس ہولناک صحرا کا نقشہ پیش کیا ہے، جہاں اس خاندان کا گزر ہوا اور سخت صعوبتیں اٹھائیں۔

وادیِ درد بے کہ ہزارش بلا خاک بلا خیز، وغبارش بلا
لالۂ خودروش زخونِ شہید ذرہ اش از جوہرِ تیغِ یزید
گشت دراں وادیِ آشوبناک جامۂ عریانیِ شاں چاک چاک
ہر قدم آنجا بسر دار بود عمر بدۂ آبلہ و خار بود
آبلہ ساغر شد و ساغر نشد زہرہ شد آب و لبِ شاں تر نشد

ناگہاں وہ ایک درویش کے تکیہ تک پہونچ جاتے ہیں اور اپنا قصۂ درد سناتے ہیں:-

از تپش آباد جنوں می رسیم تا بہ گرد سینہ بخوں می رسیم
آئینۂ بخت سیاہیم ما حسرتیِ کسبِ نگاہیم ما
از نفسے فیضِ مسیحا بیار مژدۂ اقبال تمنا بیار

درویش ان کا طالع دیکھتا ہے تو مایوس ہو جاتا ہے کیونکہ وہاں تاریکی کے سوا کچھ نہیں، پھر بھی وہ خدا سے التجا کرتا ہے کہ:-

اے تو خداوندِ جہاں رحم کن بر من و ایں عمزدگاں رحم کن

اور خدا اجازت دیتا ہے کہ ایک بار وہ جو چاہیں طلب کریں۔ یہ خبر سن کر عورت کو پھر اپنا عہدِ حسن و شباب یاد آجاتا ہے اور وہ بے اختیار یہ دعا مانگتی ہے کہ:-

بس ز تو خواہم کہ جوانم کنی رونقِ خوبانِ جہانم کنی
یوسفِ اقبال بہ خوابم رساں ہمچو زلیخا بہ شبابم رساں

اس کی یہ دعا قبول ہو جاتی ہے اور اس کا ضعیف شوہر اُٹھ کر کہتا ہے کہ اب اسے امیر و تونگر بننے کی دعا مانگنا چاہیے کہ ناگہاں ایک نوجوان شاہزادہ شکار کے تعاقب میں اس طرف آنکلتا ہے اور وہ جنگل میں ایک غیر معمولی حسین عورت

کو دیکھ کر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ عورت بھی یہ سوچ کر کہ اگر میرا شوہر تونگر ہو بھی گیا تو کیا، رہے گا ویسا ہی ضعیف و ناچار، شاہزادہ کی طرف مائل ہو گئی اور۔

پشت ہوسہائے نہاں گرم کرد جائے در آغوش جواں گرم کرد
در ہوس جلوۂ رنگِ حنا دست بیالود بہ خونِ وفا

یہ دیکھ کر اس کا ضعیف شوہر از راہِ رشک اپنی تونگری کا خیال چھوڑ کر یہ دعا کرتا ہے کہ:۔

سازِ تلافی سلوکش بساز مسخ کن و مادۂ خوکش بساز

اور اس بد دعا کے نتیجے میں وہ

خوک شد و بد نفسی[1] ساز کرد با سر و رُو عربدہ آغاز کرد

اور شہزادہ نے:۔

راست زآسیب بزمیں بر فگند بر سر رشک از سر زیں بر فگند

لڑکا اپنی ماں کو اس مسخ شدہ صورت میں دیکھ کر بے چین ہو گیا اور اس نے دعا کی خدایا تو پھر اس کو اپنی اصلی حالت پر لے آ ـــــ اور وہ جیسی تھی ویسی ہی ہو گئی۔

روئے نہاں سوئے سفیدش سیاں واں لب و دنداں وصدائش بیاں

چراغ دیر غالب کی یہ مثنوی شاعرانہ محاسن، تعبیرات نادرہ، ندرت تشبیہ و کنایہ اور جذبات کی بے اختیاری کے لحاظ سے بڑی عجیب و غریب چیز ہے۔

---

[1] غالب کا یہ لطیفہ مشہور ہے کہ جب اس نے یہ مصرعہ نظم کیا "خوک شد و بچہ زدن ساز کرد" تو اس پر اعتراض ہوا کہ خوک (سور کے) بچے نہیں ہوتا، بلکہ شتم یا کفر ہوتا ہے۔ غالب نے یہ سن کر کہا کہ نہ میں نے کبھی سور پالے نہ میرے باپ دادا نے، مجھے کیا خبر کہ سور کے بچے ہوتا ہے یا کچھ اور۔ اسکے بعد بچہ زدن کو بد نفسی سے بدل دیا۔

یہ مثنوی انھوں نے اس وقت لکھی ہے جب وہ دہلی سے کلکتہ جاتے ہوئے بنارس میں چند دنوں کے لیے ٹھہر گئے تھے اور وہاں کے مناظر حسن و جمال نے انھیں از خود رفتہ بنا دیا تھا۔

یہ مثنوی زیادہ طویل نہیں۔ تقریب ۱۰۰ اشعار کی ہے، لیکن چند اشعار میں انھوں نے اپنا سارا جمالیاتی ذوق سمیٹ کر سامنے رکھ دیا ہے اور اس کوشش میں جس جوش، خروش اور جس گرمی کے ساتھ انھوں نے یہ مثنوی لکھی ہے، اس کا اظہار وہ خود اس طرح کرتے ہیں:۔

نفس با صور دمسازست امروز ۔ خموشی محشر رازست امروز
رگ سنگم، شرارے می نویسم ۔ کف خاکم غبارے می نویسم
دل از شور شکایتہا بہ جوش ست ۔ حباب بے نوا طوفاں خروش ست

(شرار نوشتن، غبار نوشتن اور طوفاں خروش بیدلانہ ترکیب ہے۔)

شکایت گونہ دارم از احباب ۔ کتان خویش می شویم بہ مہتاب

(دوسرا مصرع بالکل بیدل کا ہے)

در آتش، از نوائے ساز خویشم ۔ کباب شعلۂ آواز خویشم

اس کے بعد وہ اپنے دہلی سے باہر نکلنے کا ذکر کرتے ہیں کہ:۔

محیط انگندہ بیرون گوہرم را ۔ جگر دا فشاندہ آہن جوہرم را
کس از اہل وطن غمخوار من نیست ۔ مرا در دہر پنداری وطن نیست

پھر اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ اگر دلی چھٹ گئی تو کیا غم کیونکہ اب میں ایسی جگہ ہوں کہ:۔

کہ می آید بہ دعوے گاہ لافش ۔ جہان آباد از بہر طوافش

(یعنی خود دلی جس کے طواف کے لیے بیتاب ہے۔)

اس کے بعد وہ بنارس کا ذکر شروع کرتے ہیں:-

تعالی اللہ بنارس چشم بد دور — بہشت خرم و فردوس معمور
تناسخ مشرباں چوں لب کشایند — بکیش خویش کاشی را ستایند
کہ ہر کس کاندراں گلشن بمیرد — دگر پیوند جسمانی نگیرد
چمن سرمایۂ امید گردد — بمردن زندۂ جاوید گردد

(یعنی باوجودیکہ تناسخ ہندوؤں کا خاص عقیدہ ہے، لیکن کاشی کے متعلق ان کا یہ خیال ہے کہ جو شخص یہاں مر جاتا ہے وہ پھر کوئی اور جسم اختیار نہیں کرتا، گویا یہاں مرجانا زندۂ جاوید ہو جاتا ہے۔)

یہاں کی فضا اور آب و ہوا کے متعلق فرماتے ہیں:-

شگفتے نیست از آب و ہوایش — کہ تنہا جاں خورد اندر فضایش
ہمہ جانہائے بے تن کن تماشا — ندارد آب و خاک ایں جلوہ حاشا

(تعجب کی بات نہیں اگر یہاں روح و جان کے سوا کچھ نہیں کیونکہ یہاں کی فضا ہی ایسی ہے اور آب و خاک کی زندگی سے اس کو کوئی تعلق نہیں)

اسی خیال کی تکرار وہ اس سے زیادہ نادر و لطیف انداز میں یوں کرتے ہیں کہ:-

نہاد شاں چو بوئے گل گراں نیست — ہمہ جان اند جسمے درمیاں نیست

(یہاں کی زندگی تو بالکل بوئے گل کی طرح سبک و لطیف ہے، یہاں تک کہ اگر ہم یہ کہیں کہ یہاں کا انسان جان ہی ہے اور جسم سے اس کا کوئی تعلق نہیں، تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا۔)

اس کے بعد ان کی فکر شاعرانہ کچھ اور آگے بڑھتی ہے، یہاں تک کہ وہ

بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں کہ :-

بہ تسلیم ہوائے آں چمن زار   ز موجِ گل، بہاراں بستہ زنار

موجِ گل کو زنار کہنے کا خیال صرف بتکدۂ بنارس ہی میں پیدا ہو سکتا تھا جس کے متعلق وہ آخر کار کھل کر کہہ اٹھتے ہیں کہ :-

سوادش پائے تختِ بت پرستاں   سراپایش زیارت گاہِ مستاں

عبادتخانۂ ناقوسیاں ست   ہمانا کعبۂ ہندوستان ست

اس کے بعد وہ پری وشانِ کاشی کے ذکر پر آجاتے ہیں اور اپنی پوری شاعرانہ قوت صرف کر دیتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

بتانش را ہیولیٰ شعلۂ طور   سراپا نورِ ایزد چشمِ بد دور

میانہا نازک و دلہا توانا   ز نادانی بہ کارِ خویش دانا

(یعنی بتانِ کاشی کی تعمیر شعلۂ طور سے ہوئی ہے اور سراپا نور ہی نور ہیں)

ادائے یک گلستاں جلوہ سرشار   خرامے صد قیامت فتنہ، در بار

(یک گلستاں جلوہ ــ صد قیامت فتنہ، تصرف تبدیلی ہے)

ز انگیزِ قد، انداز خرامے   بہ پائے گلبنے گسترده دامے

(ان کی خوش قامتی (زنانہ) و خوش خرامی کا انداز! ــــ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی پھول والے درخت کے پائیں جال بچھا ہوا ہے۔)

ز رنگیں جلوہا، غارت گرِ ہوش   بہارِ بستر و نوروزِ آغوش

(دوسرے مصرع میں جنسی ہیجان کو جس حسن کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اس کی داد صرف لذّتِ خاموش ہی سے ہو سکتی ہے۔)

ز تابِ جلوۂ خویش، آتش افروز   بتانِ بت پرست و برہمن سوز

(دوسرے مصرع کے زور کو دیکھئے)

قیامت قامتاں، مژگاں درازاں ز مژگاں بر صفِ دل نیزہ بازاں

بہ تن، سرمایۂ افزایشِ دل سراپا مژدۂ آسایشِ دل

اس سے زیادہ لطیف تعبیر ان کے جسم کی لطافت و نعومت، لوچ اور نرمی ملاحظہ ہو۔

بہ مستی موج را فرمودہ آرام ز لغزے آب را بخشیدہ آرام

(گویا پانی ایک موج ہے جو ایک جگہ ٹھہر کر رہ گئی ہے۔)

اس کے بعد وہ بتانِ کاشی سے ہٹ کر یہاں کی سرزمین و فضا کا ذکر کرتے ہیں کہ:۔

بیاباں در بیاباں لالہ زارش گلستاں در گلستاں نوبہارش

پھر وہ ایک مردِ روشن ضمیر سے پوچھتے ہیں کہ اس زمانہ میں جب اخلاق و مروت دنیا مفقود ہو چکے ہیں اور باپ بیٹے بھی ایک دوسرے کے دوست نہیں، قیامت کیوں نہیں آجاتی، اور وہ کونسا وقت ہوگا جب صورِ قیامت پھونکا جائے گا، تو وہ سرزمینِ کاشی کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے کہ:۔

کہ حقا نیست صانع را گوارا کہ از ہم ریزد ایں رنگیں بنا را

(خدا یہ نہیں چاہتا کہ قیامت آئے اور یہ رنگین شہر برباد ہو جائے۔)

غالب کی تمام مثنویوں میں یہی ایک مثنوی ایسی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان پر کبھی اک زمانہ اعادۂ شباب کا آیا تھا اور اس قدر تند و سخت کہ وہ اس کے اظہار سے باز نہ رہ سکے۔

رنگ و بو

غالب کی اس مثنوی میں کوئی نمایاں خصوصیت نہیں ہے، سوا اس کے کہ جہاں جہاں اس نے کرداروں کی تصویر پیش کی ہے وہاں بیشک اس کی انفرادیت نمایاں ہے، مقصد کے لحاظ سے یہ بالکل متصوفانہ چیز ہے،

جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ دنیا میں جاہ و دولت، قوت و جبروت بے اعتبار چیزیں ہیں، اصل چیز وہ روحانی ریاضت و ہمت ہے جو انسان کو شہودِ حق کی منزل تک لے جاتی ہے۔

اس مقصد کے اظہار کے لیے غالب نے ایک تمثیلی کردار کسی بادشاہ کا پیش کیا ہے، جو بڑا سخی و فراخ دست تھا،

بادۂ سرمستی دل را، خمے از نمِ تردستی خود قلزمے

ایک بار اس نے عام اعلان کر دیا کہ جو شخص اپنی حاجت لے کر آئے گا وہ پوری کی جائے گی، اس صلائے عام کو سن کر جوق در جوق اس کے حضور میں پہونچ گئے جن میں ایک درویش بھی تھا۔

از تب و تابِ دلِ خویش اخگرے زیرِ لحافے کفِ خاکسترے
ہیچ گہ از بخت نیاسودۂ چہرہ بہ گردِ سفر آلودہ
سر بسر آئینۂ عرضِ شکست کہنہ گلیمے و کدوئے بدست

اس نے بادشاہ سے کہا کہ میں کوئی گدا نہیں ہوں کہ خیرات و دینار طلب کروں، بلکہ

با تو فروشندۂ کالاستم

اپنا مال بیچنے آیا ہوں۔

بادشاہ نے کافی روپیہ دے کر اس کا کدو اور کمل لے لیا اور رخصت کر دیا۔ رات کو جب وہ سو گیا تو پردۂ خواب پر ایک نہایت جمیل عورت اس شان سے نمودار ہوئی کہ۔

راستیے از نور برافراشتہ پردۂ رنگے بگل انباشتہ
در نظر از شوخیِ اعضائے او بود چمن خیز سراپائے او

پرچم نور! تھی۔ تپے ہوئے پھولوں سے لدی ہوئی، اور حسن و جمال کا یہ عالم کہ اس کا سراپا گویا چمن ہی چمن تھا۔

بادشاہ نے اس سے پوچھا تو کون ہے اور کیوں آئی ہے تو اس نے جواب دیا کہ میں تیری دولت ہوں، تیرا جاہ و جلال ہوں۔

گفت کہ من دولت و مالِ توام آئینۂ جاہ و جلالِ توام

لیکن اب تو نے ایک درویش سے اس کے کمل کا سودا کر لیا ہے اور میرا تیرے پاس کیا کام۔

بوئے گلیمے بدماغم زدی سیلی صرصر بہ چراغم زدی

بادشاہ نے یہ سن کر ہنسی خوشی اسے رخصت کر دیا، لیکن اس کے بعد ہی خواب میں ایک دوسری صورت سامنے آئی، نہایت تنومند، قوی ہیکل۔

رند قوی پنجۂ خصم افگنے جم سرو برگے و تہمتن تنے

بادشاہ نے پوچھا تو کون ہے تو اس نے کہا کہ میں تیری قوت و جبروت ہوں۔ جب تک دولت تیری رفیق رہی میں بھی تیرا ساتھی رہا لیکن اب دلق و لدو سے میرا کیا میل ہے۔

بادشاہ نے یہ سن کر اسے بھی رخصت کر دیا اور اس کے بعد ایک تیسری صورت اور نظر آئی۔

جلوہ گرے آفت نظارۂ برق زمثالِ وے انگارۂ

رنگ گل آئینۂ دیدار او موج پرے جوہر رفتار او

جلوۂ جنت زغبار رش مارمے چشمۂ کوثر، زنمیکش نمے

یعنی جنت نام ہے اس غبار کا جو دم رفتار اس کی خاک پا سے بلند ہوا اور چشمۂ کوثر عبارت ہے اس کے دریائے ہستی کے ایک ہلکے سے نم سے۔

بادشاہ نے پوچھا تو کون ہے:۔

گفت من آئینۂ نازِ تو ام   ہمتِ آفاقِ گدازِ تو ام

بادشاہ نے اس سے کہا کہ مجھے تیری ہی ضرورت تھی۔ ترا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑوں گا۔

دامنت از کف نگزارم دگر

کیونکہ تو میری تاریک راتوں کی شمع اور میرے خاکستانِ ہستی کی بہار ہے۔

شمع و چراغِ شبِ تارم توئی   خاکم و سامانِ بہارم توئی

اس نے:۔   بوسہ بدستِ شہ آزاد زد

اور بولی:۔

دولت و اقبال غلام تو باد   تاب و تواں بادۂ جام تو باد

کیونکہ انسانی کامیابی کا راز صرف ہمت مردانہ ہے۔ ظاہری جاہ و دولت کوئی چیز نہیں۔

دردِ دل از آزادِ دل اندیشہ کن   گنج برافشاں و کرم پیشہ کن

اس کے بعد غالبؔ خود اپنے آپ سے پوچھتا ہے کہ تیرا وہ تیرے ساز کی وہ اثر آفرینی کہاں گئی اور وہ تیرا نغمہ کہاں ہے جو پتھر کو پانی کر دیتا تھا۔

آں اثرِ پردۂ سازت چہ شد   زمزمۂ خارہ گدازت چہ شد

تو بھی ہوسِ جاہ میں مبتلا ہو گیا اور اپنے آپ کو کنوئیں میں ڈھکیل دیا۔

در ہوسِ جاہ فرو رفتہ ای   حیف کہ در چاہ فرو رفتہ ای

ایک وقت تھا جب تو

چشمِ پریشاں نظرے داشتے   جلوہ بہ ہر رہگزرے داشتے

اور اب یہ حال ہے کہ:۔

چشم پریشاں نظرے داشتے جلوہ بہ ہر رہگزرے داشتے

اور اب یہ حال ہے کہ :-

ہر چہ کنوں می سپرم در نظر شاہد و شغرست و شراب و شکر

عمر کی آدھی رات تو تو نے سو کر گزار دی اور باقی نصف حسرت چاندنی کی پیمائش میں

نیمہ شب از عمر تو در خواب رفت نیمہ بہ پیمودن مہتاب رفت

اب بھی ہوش میں آ، اور اوہام کو چھوڑ کر حقیقت کی طرف آ۔

پیروی وہم مکن زینہار سر ز گریبان حقیقت بر آر

جو کچھ ملتا ہے وہ خود اپنی ہمت سے ملتا ہے۔

آنکہ دریں پردہ سگالی بود از اثر ہمت عالی بود

مگر کس قسم کی ہمت؟ وہ نہیں جو مادی علایق سے متعلق ہے بلکہ وہ جو۔

بادہ ز خمخانۂ لا می دہد

اور نفی ماسوا کی طرف لے جاتی ہے

بادِ مخالف پانچویں مثنوی ہے جو ہنگامہ کلکتہ سے متعلق، جہاں فارسی کے اچھے اچھے جاننے والے موجود تھے۔ جب غالب یہاں پہونچے اور ان کا کلام لوگوں نے سنا تو بعض اہلِ فن نے کچھ اعتراض کئے اور اپنی سند میں کلام قتیل پیش کیا۔ غالب جو ہندوستان کے فارسی شعراء میں صرف خسرو کو مانتا تھا اور فیضی کا بھی زیادہ قایل نہ تھا (بقول خود) "فرید آباد کے ایک کھتری" کا نام سن کر بہت برہم ہوا۔ اس پر ہنگامہ زیادہ بڑھا اور اس کے کلام پر ہر طرف سے اعتراض کی بوچھار ہونے لگی

میرزا نے جو طبعاً ہنگاموں سے گھبراتے تھے اور جس کام کے لیے آئے تھے اس

کی کاربر آری میں اس نزاع کو سنگ راہ سمجھتے تھے اس لیے "رنگ" آخر یہ مثنوی لکھی جس میں انھوں نے اپنی غریب الوطنی اور اہل کلکتہ کی نامہربانی کا ذکر کرتے ہوئے اعتراضات کا جواب بھی نہایت نرمی سے دیا۔

یہ مثنوی بیانِ حسن و عشق اور ذکرِ تصوّف سے خالی ہے لیکن چونکہ اُن کی ذات سے تعلق رکھتی ہے، اس لیے اس میں شاعری کم لیکن صداقت جذبات بہت زیادہ ہے اور اس لحاظ سے یہ نظم بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں سب سے پہلے انھوں نے اکابر کلکتہ کی تعریف کی ہے کہ:۔

اے تماشائے بزمِ سخن اے مسیحا دمانِ نادرہ فن
ہر یکے صدرِ بزمِ بار گہے شمعِ خلوت سرائے کارگہے
اے سخن را طرازِ جاں دادہ سفرہ را سازِ گلستاں دادہ
اے گرامی فسانِ ریختہ گو نغز دریا کشانِ عربدہ جو

اس شعر میں ان کو ریختہ گو کہہ کر گویا ایک طنز بھی کر دیا ہے کہ "تمھیں فارسی سے کیا واسطہ" اس کے بعد اُن کے جذبات رحم و شرافت سے اپیل کی ہے کہ:۔

اسد اللہ بخت برگشتہ در خم و پیچ عجز برگشتہ
گرچہ ناخواندہ میہمان شماست بے سخن ریزہ چینِ خوانِ شماست
آرمیدن دہید روزے چار خستہ را بہ سایۂ دیوار

پھر وہ اپنی داستانِ غم بیان کرتے ہیں جو اس مثنوی کی جان ہے۔ کہتے ہیں:۔

کیستم؟ دل شکستۂ غم زدۂ بیدلے، خستۂ، ستم زدۂ
دردمندے جگر گداختۂ از غمِ دہر، زہرہ باختۂ
حیف بلا! کشیدہ ام آخر کہ بہ بنگالہ رسیدہ ام آخر
بہ سیہ روزِ غربتم بنشد تیرہ شبہائے حشمتم بینند

بر عزیزاں کجا روا است ستم رحم اگر نیست خود چرا است ستم

یعنی اگر تم ایسے ستم زدہ شخص پر رحم نہیں کر سکتے، تو ظلم بھی نہ کرو۔

اس کے بعد پھر ان کا جذبۂ خودداری عود کر آتا ہے اور کہتے ہیں کہ جو تم میرے مقابلہ میں قتیل کا ذکر کرتے ہو سو خدا کے لیے انصاف کرو کہ وہ شخص جو غالب عرفی و نظیری کا ماننے والا ہے وہ

چہ شناسد قتیل و واقف را

چھٹی مثنوی

اس کا خاص عنوان غالب نے تجویز نہیں کیا بلکہ اس کا موضوع ایک طویل عبارت سے یوں ظاہر کیا ہے :-

در نمودارئ شانِ نبوت و ولایت کہ درحقیقت پرتو نور الانوار حضرت الوہیت۔

یہ مثنوی یکسر اعتقادی چیز ہے اس لیے اس میں محاسن شعری کی جستجو کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ اس میں تصوف کا وہی نظریہ جسے صوفیہ وحدت الشہود، لا وجود الا اللہ، وغیرہ کی مختلف اصطلاحات سے ظاہر کرتے ہیں، غالب نے بھی اس مثنوی میں بیان کیا ہے۔

یہ اصطلاحات ذہنی مفروضات کی حیثیت رکھتی ہیں جو اسلام میں صوفیہ عجم کے وساطت سے داخل ہوئیں اور جب مسلمانوں کی عملی زندگی کے اختتام کے ساتھ حکومتوں میں زوال آیا تو بہت سی خوش باش جماعتوں نے اپنا اثر قائم کرنے کے لیے یہ نیا فلسفۂ الٰہیات اختیار کیا جو صحیح تعلیمات اسلامی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، اور یونان و ہند و فلسفہ سے مستعار ہے۔

یہاں اس مسئلہ پر کسی بسیط گفتگو کا موقع نہیں، لیکن مختصراً یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ اگر اس نظریہ کو صحیح باور کر لیا جائے تو اس کی افادیت اخلاقی نقطۂ نظر سے

ضرور مسلّم ہے اور وہ یہ کہ جماعتی و مذہبی تفریق سے بلند وہ جامعۂ بشریت کی تشکیل کا ذریعہ ہو سکتا ہے، لیکن چونکہ اس کا تعلق صرف نظریہ سے ہے عمل سے نہیں، اس لیے یہ اعتقاد رضائے الٰہی اور تقدیر الٰہی کو ایک چیز قرار دیدیتا ہے اور انسان کو ہر حال میں راضی بہ مشیت الٰہی رہنے کی تعلیم دیتا ہے اور انسان اپنی ذاتی انفرادیت کھو بیٹھتا ہے۔

اس نظریہ کی تبلیغ کرنے والوں میں مولانا رومی کو خاص اہمیت حاصل ہے، جنھوں نے بہت سی حکایات وضع کر کے اس مسلک کو زیادہ دلنشیں بنایا اور بعد کو تمام وہ مرموزات (SYMBALS) جو انھوں نے اپنی مثنوی میں اختیار کیے، متاخرین میں رواج پا گئے۔

پھر لطف یہ ہے کہ وحدت وجود کا خیال صرف مناظر و مظاہر طبیعی ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ انسانی تمدن و معاشرہ تک پہونچا اور اسے پہونچنا چاہیے تھا کیونکہ جب ایک صوفی کو حجر و شجر، باغ و راغ، بہار و خزاں میں بھی ہر جگہ خدا ہی کا جلوہ نظر آتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ انسان کو وہ اس سے محروم سمجھے اور چونکہ انسانوں میں سب سے بڑے انسان ہونے کا فخر رسول اللہ صلعم کو حاصل ہے اس لیے سب سے پہلے انھیں کے اسم مبارک احمد کا میم اڑا کر انھیں "ذات احدی" کے مرتبہ تک پہونچا دیا۔

میم امکاں ابر رخ احمد ستردی لست چوں ز امکاں بگزری دانی کہ چیست

اس کے بعد اس رنگ میں اولیا کو پیش کیا گیا اور غالب نے بھی اس کا اظہار اس طرح کیا کہ :-

نور حق ست احمد و لمعانِ نور از نبی در اولیا دارد ظہور

یہاں تک کہ براہ راست خدا سے بھی طلب خیر کا سوال باقی نہ رہا بلکہ بات یہاں

تک پہونچ گئی کہ:-

چوں اعانت خواہی از یزدان پاک یا معین الدین اگر گوئی چہ باک

اس سلسلہ میں وہ موئے مبارک اور قدم رسول کی بھی مادی سطح تک پہونچ جاتا ہے اور ان کی پرستش جزو ایمان قرار دیتا ہے۔

دلنشین با بود زاں روئے موئے وہ کہ گر مانند کسے زاں موئے روئے

ہر کہ اول ہست وایماں نیز ہم چوں نور زد عشق با نقش قدم

اس سلسلہ میں غالب نے مسئلہ امتناع نظیر پر بھی گفتگو کی ہے۔ یعنی یہ کہ رسول اللہ کا نظیر و مثل پیدا ہونا ممکن ہے یا نہیں کہا جاتا ہے کہ غالب نے مولانا فضل حق خیر آبادی کے ارشاد کی تعمیل میں یہ مثنوی اسی غرض سے لکھی تھی کہ وہ امتناع نظیر کو ثابت کریں، لیکن وہ اپنی رو میں یہ لکھ گئے کہ:-

ایں کہ می گوئی توانا کردگار چوں محمد دیگرے آرد بکار

با خدا وند دو گیتی آفریں ممتنع نبود ظہور ے ایں چنیں

یعنی خدا کے لیے دوسرا محمد پیدا کرنا ممتنع نہیں۔

آنکہ مہر و ماہ و اختر آفرید میتواند مہر دیگر آفرید

یعنی جس طرح خدا نے ایک سورج پیدا کیا ہے، اسی طرح دوسرا سورج بھی پیدا کر سکتا ہے۔

جب مولانا خیر آبادی نے اس مثنوی کو پڑھا تو وہ بہت برہم ہوئے اور غالب سے کہا کہ یہ تم نے کیا بک دیا ہے۔ چنانچہ بعد کو انھوں نے چند اشعار اضافہ کرکے مولانا خیر آبادی کے ارشاد کی تعمیل کر دی۔ بعض اشعار یہ ہیں۔

لیک در یک عالم از روئے یقیں خود نمی گنجد دو ختم المرسلیں

جوہر کل بر نتابد تشنیہ در محمد رہ نیابد تشنیہ

ہر کرا با سایہ نپسندد خدا ہمچو اوئی نقش کے بندد خدا

یعنی کائنات میں صرف ایک ہی ختم المرسلین ہو سکتا ہے، اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔ ظاہر ہے کہ جب خدا کو محمدؐ کا سایہ تک پسند نہ تھا (کہا جاتا ہے کہ آپ کے جسم کا سایہ نہ پڑتا تھا) تو وہ اس کا مثل کیونکر پسند کر سکتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غالب نے کیوں اول اول امتناعِ نظیر کی تردید کی اور بعد کو پھر اسے تسلیم کر لیا کہ تسلیم کرنے کی وجہ تو ظاہر ہے کہ مولانا خیرآبادی کی فرمائش تھی اور وہ اسے رد نہ کر سکتے تھے، لیکن امتناعِ نظیر کی تردید اُن کا اصلی خیال تھا جو بے اختیار ان کے قلم سے نکل گیا اور اس کا خاص سبب تھا۔

غالب مذہباً شیعی تھے اور حضرت علیؑ کے ساتھ ان کی عقیدت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ وہ اپنے آپ کو مسلم کہنے کی جگہ "اسد اللّٰہی" کہنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ (ہم اسد اللّٰہیم وہم اسد اللّٰہیم) —— اور ایک قصیدہ میں اس نعرہ تک پہونچ گئے کہ:

فیضِ دم "انا اسد اللّٰہ" بر آورم منصور لا اُبالی بے دار و بے رسن

اور صاف صاف کہہ دیا کہ:

اے از تو بودہ رونق دینِ محمدی رومیت سہیل و کعبہ ادیم و عرب یمن

الغرض وہ تولائے علیؑ میں اس قدر سرشار تھے کہ محمدؐ اور علیؑ میں فرق و امتیاز ان کے لیے دشوار تھا اور باوجود مولانا خیرآبادی کی فرمائش کے رسول اللّٰہؐ کا امتناعِ نظیر تسلیم کرنے میں انھیں تامل تھا، کیونکہ وہ حضرت علیؑ کو بھی محمدؐ کا نظیر ہی سمجھتے تھے بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اگر ان سے علیؑ کے امتناعِ نظیر کے بارے میں کچھ لکھنے کو کہا جاتا تو وہ پہلے ہی بلا تامل لکھ دیتے اور مولانا خیرآبادی کو دوبارہ کہنے کی ضرورت نہ ہوتی۔

غالب کی یہ مثنوی یوں تو اپنے مطالب کے لحاظ سے کوئی خاص اہمیت

نہیں رکھتی، لیکن نظر بر اں کہ غالب کے اخلاق پر خاص روشنی پڑتی ہے، یقیناً اہم ہے۔

جیسا کہ میں ابھی ظاہر کر چکا ہوں کہ غالب غالی شیعہ تھے، کیونکہ وہ حضرت علیؑ کو وصی نبی اور امام اول مانتے تھے۔

شاہِ نجف، وصی نبی، مرتضیٰ علیؑ   آں از ائمہ اول و ثانی ز پنجتن

اور گو وہ تبرائی شیعی نہ ہوں، لیکن یہ کیونکر ممکن ہے کہ حضرت علیؓ کو وصی رسول اور امام اول ماننے کے بعد وہ پہلے تین خلفاء سے خوش رہے ہوں گے، لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ایک طرف تو ان کے غلو کا یہ عالم ہے کہ وہ صرف حضرت علیؑ ہی کو منتہائے انسانیت قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف یہ رنگ کہ (جیسا کہ اس مثنوی سے ظاہر ہے) یا علیؑ کے ساتھ یا معین الدین (اجمیری) کہنا بھی انھیں گوارا ہے پھر اگر اس کا سبب محض "رعایت خاطر احباب" تھا، تو اس میں کلام نہیں کہ غالب وسیع اخلاق کا انسان تھا اور اگر یہ سب کچھ غالب نے اس وقت کے سنی علماء اور مولانا خیر آبادی کے ڈر سے ایسا لکھا تو پھر ان کو سچا شیعہ باور کرنے میں بھی ہم کو تامل کرنا چاہیے، بشرطیکہ آں کہ اس سلسلہ میں تقیہ کی سپر سے کام نہ لیا جائے۔

ساتویں اور آٹھویں مثنوی

یہ دونوں مثنویاں تہنیت "عید شوال" سے متعلق ہیں۔ پہلی مثنوی میں بہادر شاہ ظفر کی تہنیت ہے اور دوسری میں ولی عہد کی۔ دونوں مثنویاں بہت مختصر ہیں۔

ساتویں مثنوی کے ابتدائی چند اشعار کو چھوڑ کر جن میں غالب نے اپنا ذکر کیا ہے۔ باقی تمام اشعار ہلکے ہیں اور ان میں جوشِ مسرت کے لحاظ سے کوئی شعر ایسا نہیں جو عرفی کے اس شعر کا جواب ہو سکے۔

صباح عید کہ در تکیہ گاہ ناز و نعیم   گدا کلاہِ نمد کج نہاد و شہ دیہیم

سبب ظاہر ہے کیونکہ عرفی دربار جہانگیر کا شاعر تھا جب بذل و نوال عام تھا اور ہر شخص اپنی جگہ مسرور و خوشحال تھا، برخلاف اس کے غالب بزم تیموری کی آخری بجھتی ہوئی شمع کا دیکھنے والا تھا، جب خود بادشاہ مصائب میں مبتلا تھا۔ اس لیے غالب کی تہنیت بالکل رسمی سی بات ہے اور اس میں حقیقت کی کوئی دلکشی نہیں پائی جاتی بلکہ ہنسی آتی ہے یہ دیکھ کر کہ جس فرمانروا کی حکومت دہلی کی چہار دیواری کے اندر متزلزل ہو، اس کے متعلق یہ کہنا کہ

عزمش اگر بانگ براشہب زند قافلۂ خود بدل شب زند
حفظش اگر عام کند ایمنی شمع پذیرد زہوا روشنی

کیسی مضحک بات ہے۔

ہاں آغاز مثنوی میں خود اپنی شاعری کے متعلق غالب کا یہ کہنا ؎

از اثر ناطقۂ بندم طراز
غازہ ہنم بر رخ خورشید و ماہ
ساختہ ام خامہ زبال پری

البتہ نادرست نہیں ۔ یہی رنگ آٹھویں مثنوی کا ہے جو ولی عہد کی تہنیت سے متعلق ہے۔

نویں، مثنوی

ایک منظوم تقریظ ہے شاہ اودھ کے دیباچۂ نثر "لبت و ہفت افسر" پر، جس میں غالب نے کافی شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ اس کی تعریف کی ہے اور اس کے دو تاریخی نام۔ "نیر اعظم" اور "ریاض ملک معنی" بھی تجویز کیے ہیں۔ اول تو یہ مثنوی اتنی مختصر نظم ہے کہ اسے مثنوی کہنا بھی زیادتی ہے، لیکن اگر اصطلاحاً اسے "صنف مثنوی" سے علحدہ نہیں کیا

جا سکتا، تو مثنوی نگاری کی ضروری شرائط سے یقیناً معرّا ہے۔

دسویں مثنوی | یہ مثنوی بھی منظوم تقریظ ہے سرسید احمد خاں کے تصحیح کردہ ہوئے نسخۂ آئینِ اکبری، کی اور چونکہ یہ کارنامہ کسی بادشاہ یا امیر کا نہ تھا بلکہ سید احمد خاں کا تھا اس لیے غالب نے اس میں بڑی آزادی سے کام لیا ہے اور صاف صاف کہہ دیا ہے کہ یہ زمانہ داستان پارینہ دہرانے کا نہیں اور اگر ہم مان لیں کہ آئین اکبری بڑا اچھا آئین تھا تو بھی اس کا ذکر اب بے معنی ہے، اس زمانہ میں انگریزی حکومت اور اس کی ترتیبوں کو دیکھنا چاہیے' چنانچہ کہتا ہے۔

صاحبانِ انگلستاں را نگر شیوہ و انداز اینان را نگر

تا چہ آئیں با پدید آوردہ اند انچہ ہرگز کس ندید آوردہ اند

اور اس سلسلہ میں مغربی ایجادات کا ذکر کرتے ہوئے دخانی جہاز، برقی روشنی گراموفون وغیرہ کی طرف اشارہ کیا ہے اور پھر سرسید کو مشورہ دیا ہے کہ لندن جاؤ اور دیکھو کہ وہاں کا کیا رنگ ہے۔

رو بہ لندن کاندراں رخشندہ باغ شہر روشن گشتہ در شب بے چراغ

کاروبار مردم ہشیار بیں در ہر آئیں صد نو آئیں کار بیں

اس زمانہ میں آئین اکبری کا ذکر کرنا گویا مُردہ پروری ہے اور

مُردہ پروردن مبارک کار نیست خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست

حیرت ہے کہ وہی غالب جو اس سے قبل اپنی بعض مثنویوں میں کافی "مردہ پروری" کا ثبوت دے چکا ہے، اس وقت اس کی مخالفت کر رہا ہے۔ [illegible]

کہ اس کا سبب انگریزوں کو خوش کرنا ہو جن سے اسے کار برآری کی امید تھی یا پھر یہ کہ واقعی اس کے احساس میں کوئی خاص تغیر پیدا ہو گیا ہو۔

مثنوی ابر گہربار

مرزا کی آخری مثنوی ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ واقعی حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے، یہ مثنوی باوجود ناتمام ہونے کے کم و بیش ۷۵۰ اشعار پر مشتمل ہے اور مرزا کا بڑا زبردست شاہکار ہے۔

یوں تو غالب کے فکر و بیان کی وہ انفرادی خصوصیت جو ہر صنف سخن میں اس کے یہاں نمایاں ہے اس کی بعض دوسری مثنویوں میں بھی پائی جاتی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میرزا کے لب و لہجہ، میرزا کے انداز فکر اور اس کے جوش بیان کا جو دلکش امتزاج مثنوی "ابر گہربار" میں نظر آتا ہے، اس کی دوسری مثال ادب فارسی میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

یہ مثنوی نہ صرف غالب کی شاعری بلکہ اس کی طبیعی و طبیعیاتی میلانات کی بھی بہترین نمائندہ ہے جسے وہ اپنی زبان میں ——— مراکرہ اند آشکارا بہ من ——— کہتا ہے ——— اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کا ایک سبب ہے۔

غالب یوں چاہے رند بادہ خوار رہا ہو یا کچھ اور لیکن اپنے عقاید کے لحاظ سے وہ یقیناً غالی شیعی تھا، وہ جہاں کہیں حضرت علیؑ کا ذکر کرتا ہے بالکل بے قابو ہو جاتا ہے جو انتہائے عشق و ولا کے عالم میں بے اختیارانہ وغیرہ ذمہ دارانہ کہا جا سکتا ہے۔

مثلاً پانچویں قصیدہ میں وہ حضرت علیؑ کو اس طرح پیش کرتا ہے

شاہِ نجف، وصی نبیؐ، مرتضیٰ علیؑ آں از ائمہ اول، وثانی ز پنجتن

دانش دلیلِ قاطعِ ختمِ نبوت است | وقتِ غروبِ مہر دُند ماہ بے سخن
بالیدہ از تو علم و عمل در پناہِ دیں | اے آبروئے خلوت و اے فخر انجمن

اور پھر انتہائی جوش میں آکر اپنے متعلق کہتا ہے۔

فیضِ دمِ "انا اسد اللہ" برآورم | منصورِ لاابالیِ بے دار و بے رسن

چھٹے قصیدہ میں وہ جنابِ امیرؑ کو صفِ انبیاء سے بھی اوپر لے جاتا ہے۔

ہم شوکتِ آثارِ علیؑ بود کہ داؤد | صد چشم برہ داشت زاجزائے زرہ ہا
ہم مژدۂ دیدارِ علیؑ بود کہ می ریخت | در پردۂ اعجاز لب، دکام مسیحا

یعنی داؤد کی زرہ بھی آثار علی ہی کرشمہ تھی اور عیسیٰ کے لب جاں بخش کی جنبش بھی مژدۂ دیدار علی کا صدقہ تھا۔ اسی سلسلہ میں وہ یوسف اور موسیٰ کا بھی ذکر کرتا ہے لیکن اس طرح:۔

ہم موجۂ رفتار تو ذوقِ رخِ یوسف | ہم جادۂ راہِ تو رگِ خوابِ زلیخا
در گردِ خرامِ تو نگہ ریشۂ طوبیٰ | در بزمِ تماشائے تو مژگاں یدِ بیضا

ساتواں قصیدہ بھی منقبت کا ہے اور اس میں ایک جگہ وہ خدا اور علی کے درمیان پردۂ امتیاز کو بھی چاک کر دیتا ہے۔

یارب ز یاد علی نہ شناسم قلندرم | یکسے زآبگینہ و ساغر برآورم
در دل بہ جستجو ہمہ ایزد درآورم | وز لب بہ گفتگو ہمہ حیدر برآورم

ایک اور قصیدہ میں وہ حضرت علیؑ کو:۔

نفسِ نبیؐ، خدائے نصیری، امام خلق

کے الفاظ سے یاد کرتا ہے۔

غالب نے نعت اور منقبت کے جتنے قصاید لکھے ہیں، ان میں جوش ولولا تو ضرور ہے لیکن تغزل بہت کم۔ حالانکہ عرفی کی طرح غالب کے بعض مدحیہ قصاید

میں بہت سے اشعار متغزلانہ رنگ کے بھی پائے جاتے ہیں۔

جس مثنوی (ابر گہر بار) کا ذکر اس وقت مقصود ہے، وہ بھی جناب امیر کی منقبت سے تعلق رکھتی ہے لیکن اس کا رنگ قصائد سے مختلف ہے، اور ہونا چاہیئے کیونکہ اول تو یہ مثنوی ہے (جو بیانیہ شاعری کی خاص صنف ہے اور تجزیہ جذبات کی کافی وسعت اپنے اندر رکھتی ہے۔) دوسرے یہ کہ یہ مثنوی شاید غالب نے اس وقت لکھی تھی جب وہ "شکایتے کہ نہ گنجد بہ دل زبیدلی" کی منزل سے گزر رہے تھے اور اس شدید عقیدت و محبت کی وجہ سے جو انھیں حضرت علی کی ذات سے تھی، اس مثنوی میں انھوں نے وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو ایک انسان بر بنائے اعتماد و خلوص اپنے محبوب سے کہہ سکتا ہے۔

اس مثنوی کے کئی حصے ہیں جن میں حمد، نعت، منقبت، ساقی نامہ، مغنی نامہ اور معراج نامہ کے علاوہ ایک مناجات بھی شامل ہے جس میں انھوں نے اپنے دل کے جلے پھپھولے پھوڑے ہیں اور غالباً اسی مقصود کے پیش نظر انھوں نے یہ مثنوی لکھی تھی۔

اس مثنوی کا آغاز سپاس نامہ سے ہوتا ہے جس میں تفصیل کے ساتھ مبداء فیاض کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ کائنات کی کونسی چیز ہے جو اس کا منظہر نہیں، اس کی شاہد نہیں۔

زہر پردہ بیدا نوا سازئے	بہر جلوہ پنہاں نظر بازئے
بہ کشور کشایان دم گیر و دار	بہ مسکیں گدایان غم پود و تار
بہ مے در فروغے کہ چوں برزند	زسیمائے میخوارہ نشتر زند
بہ نے در نوائے کہ چوں بر کشد	بہ آواز آں نالہ ساغر کشد
بہ آزادہ، دستے کہ ساغر زند	بہ افتادہ، سنگے کہ بر سر زند

اس کے بعد اس نے مختلف پہلوؤں سے خدا اور کائنات کے تعلق کو ظاہر کیا ہے کہ دنیا میں ہر شخص خواہ کسی مذہب و مسلک کا پیرو ہو، اس کا مقصود صرف اسی ایک ذات خداوندی کی پرستش ہے جس کے جلوؤں سے دنیا معمور ہے۔

بہ ہر لب کہ جوئی نوائے از دست — بہ ہر سر کہ بینی ہوائے از دست

یہاں تک کہ جو صنم پرست ہے اس نے بھی:-

بہ بت سجدہ زاں رو روا داشتہ — کہ بت را خدا وند پنداشتہ

اور جو آتش پرست ہیں وہ بھی:-

بہ آتش نشانِ خدائی دہند

الغرض:-

نظرگاہِ جمع پریشاں یکے ست — پرستند انبوہ و یزداں یکے ست

اس سپاس نامہ کے بعد جو انتہائی جوش و خروش سے نظم کیا گیا ہے، وہ مناجات شروع کرتا ہے اور اس سلسلہ میں وہ کہتے کہتے اس منزل تک آتا ہے جب ان سپاسگزاریوں کے بعد وہ حرفِ شکایت زبان پر لاتا ہے اور یہ حصہ نہ صرف یہ کہ اس مثنوی کی جان ہے، بلکہ غالب کا وہ شاہکار ہے جس کی نظیر فارسی زبان میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

وہ سب سے پہلے قیامت کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں غالب نے اس مناجات میں اپنا دل چیر کر سامنے رکھ دیا ہے اور طنز و شوخ نگاری کا جو انداز اس نظم میں اس نے اختیار کیا ہے وہ اس لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتا کہ اس میں نہایت شدید احساسِ غم بھی شامل ہے اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ اپنی زندگی کے تلخ حقائق کو اس سے بہتر اسلوب میں پیش کر سکتا تھا۔

جذبات اور شاعرانہ محاسن دونوں حیثیتوں سے غالب کی یہ مثنوی قدر اول کی حیثیت رکھتی ہے اور جمالیاتی احساس کے نقطۂ نظر سے "چراغِ دیر" اپنی اپنی جگہ بڑی قابلِ قدر چیز ہے۔

مثنوی "ابر گہر بار" میں ان کے مناجات کا وہ حصہ جہاں خدا سے انھوں نے گفتگو کی ہے، غالب کا شاہکار ہے۔

قیامت قائم ہے نفسی نفسی کا عالم ہے، کوئی کسی کا پرسانِ حال نہیں، میزانِ عدل قائم ہے لوگوں کے اعمال وزن کیے جا رہے ہیں، کسی کی نیکی کا پلہ بھاری ہے اور کسی غریب کی بدیاں نیکیوں پر غالب ہیں، انہی گنہگارانِ گیر و دار میں غالب بھی شامل ہیں، بارگاہِ کبریائی سے حکم ہوتا ہے کہ اس بندے کے بھی اعمال تولو، مرزا سنتے ہی اور سوچتے ہیں کہ میرے نامۂ اعمال میں بدی کے سوا اور کیا ہے، وہ آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "بارِ خدایا مجھے کچھ عرض کرنا ہے" اور وہ یہ کہ اے میرے مولا، میں تیرا حد درجہ بے بضاعت نالائق بندہ ہوں اور سخت گناہگار، اس لیے میرے اعمال کے تولنے کی زحمت نہ فرما، میرے دماغ اور بہرے ہو جائیں گے مناسب یہ ہے کہ تو میرے رنج و غم کو تول لے کہ میرا سرمایۂ عمر تو سوا رنج و غم کے اور کچھ تھا ہی نہیں جو تیرا ہی عطیہ تھا، اس لیے اب مجھے دوزخ میں ڈالنے اور عذاب ہی دینا منظور ہے، تو پھر اس کی آسان ترکیب یہ ہے کہ تو سمجھ لے حساب کتاب ہو گیا اور مجھے دوزخ میں بھیج دے لیکن اگر میرا حساب کتاب ہونا ضروری ہے تو پھر مجھے بھی کچھ کہنے کی اجازت دیجیے، معاف کیجیے، میں بہت عاجز ہو چکا ہوں، اور جب آپ بغیر کہے ہی سب کچھ جانتے ہیں تو پھر میں کیوں نہ کہوں۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں کافر نہیں ہوں، آتش پرست نہیں ہوں،
سورج کو میں نے کبھی نہیں پوجا، نہ کسی کو مارا، نہ کہیں ڈاکہ ڈالا، البتہ اس
سے انکار نہیں کہ میں نے شراب پی اور ضرور پی۔ لیکن اس طرح کہ خود مجھے اس
بات پر شرم آتی ہے۔ اس لیے اگر شراب ہی کا حساب کتاب کرنا ہے تو جمشید
بہرام، پرویز وغیرہ سے حساب کیجیے، میں، میں کیا اور میری بادہ نوشی کیا، جب
جب پی بھیک مانگ کر پی، نہ کوئی باغ، نہ کوئی معشوق، نہ مطرب، نہ ساز
یہ بھی کوئی مے نوشی تھی۔

میں نے زندگی تو گزار ہی دی مگر اب کیا کہوں کہ کس مصیبت سے گزاری
ہے، سالہا سال بے پیے گزار دیے اور اس عالم حسرت و یاس میں کہ جب ساون
بھادوں کی گھٹائیں جھوم جھوم کر آتی تھیں تو میرا جام شراب سے خالی ہوتا تھا۔
دنیا بھر سبزۂ خودرو کی بہار سے مست و سرشار رہتی تھی اور میرے گھر کا دروازہ
بند کیے خاموش پڑا رہتا تھا، زمانہ بھر میں پھول کھلے ہوتے تھے دنیا راگ رنگ
میں مست رہتی تھی اور میں غمزدہ اپنے حجرہ میں بند۔ اگر اتفاقاً کبھی شراب ملی
تو پیالہ نہ ملا یا پیالہ ملا تو شراب نہ ملی۔

ہمسایوں نے میرے ساتھ بدسلوکیاں کیں یار داروں نے مجھے فریب دیے
بے مایہ اور کم حیثیت لوگوں سے مجھے معلوم کرنا پڑا۔ عمر بھر بینوا رہا، نہ میرے زمانہ میں
کوئی ایسا بادشاہ ہوا کہ ظہوری کی طرح مجھے انعام دیتا اور میں اس کو فقیروں
اور مسکینوں کو تقسیم کر دیتا۔ نہ تو نے مجھے کوئی معشوق دیا کہ میں اس کے ناز
اٹھاتا اور خوش ہوتا۔

اب کیا کہوں کیا کیا مصیبتیں میں نے اٹھائی ہیں اور کیا کیا آفتیں مجھ پر
پڑی ہیں، ایک تو یہ ہے کہ جب مجھے وہ باتیں یاد آتی ہیں تو بہشت بھی مجھے ہیچ نظر

آتی ہے، پھر تو ہی انصاف کر کہ جو شخص بہشت کو بھی کچھ نہ سمجھے اُسے دوزخ میں بھیجنا کہاں تک جائز ہے۔

اور فرض کیجیے کہ آپ نے مجھے جنت بخش دی تو بھی اس سے کیا ہوتا ہے۔ جنت میں وہ باتیں کہاں، اگر وہاں صبوحی کے طور پر شراب طہور مل گئی بھی تو جام بلوریں اور زہرۂ صبح کا منظر کہاں۔

معشوق کے بدلے حور ہے۔ مگر نہ اس سے غم ہجرت کا لطف آسکتا ہے نہ ذوق وصل پیدا ہو سکتا ہے، وہ جو ہم پر ایک بوسہ کے بدلے ہزاروں احسان لاد دیتے تھے، وہ جن کے وصل کے انتظار میں برسوں ہم کو گزارنا پڑتے تھے۔ وہ جو ہم میں اور ہمارے عشوق میں کشاکش ہوتی ہے، ہم کھینچتے تھے اور وہ بھاگتا تھا، وہ جو ہم کو جھوٹی قسمیں کھا کھا کر فریب دیتا تھا، یہ تمام باتیں اس نیک بخت حور میں کہاں، یہاں تو یہ حالت ہے جو بات کہی مان لی، جو حکم دیا بجالائی، یہ بھی کوئی حسن کا انداز ہے، جنت نام کی جنت ہے۔ یہاں نظر بازی کا موقع کہاں، نہ یہاں دیوار میں کوئی روزن کہ جھانک کر لطف ہو نہ کوئی دلالہ کہ پیغام سلام لے جائے۔

یہی ساری باتیں تھیں جن کو ہمیشہ دل چاہتا تھا اور کبھی پوری نہ ہو سکی تھیں، اس لیے اگر تو میرے گناہوں کا حساب کرے گا تو میں بھی ہر گناہ کے مقابلہ میں ایک حسرت پیش کروں گا، اور جب گناہوں سے زیادہ میری حسرتیں ہوں گی تو پھر تو ہی بتا کہ حساب کی کیا صورت ہوگی۔

اب انھیں باتوں کو غالب کی زبان سے سنیے:۔

بود شش ترازو دمنہ بار من نسنجیدہ بگزار، کردار من
اگر دیگراں را بود گفت و کرد مرا پایہ جز رنج است و درد

مرا نیز یار اے گفتار دہ چو گویم بران گفتہ زنہار دہ

دل از غصہ خوں شد نہفتن چہ سود چو ناگفتہ دانی نہ گفتن چہ سود

بہارا تو دانی کہ کافر نیم پرستار خورشید و آذر نیم
نکشتم کسے را بہ اہرمنی نہ بردم کسے مایۂ در رہزنی
گرمے، کہ آتش بگورم از دست بہنگامہ پرداز سورم از دست
حساب مے و رامش و رنگ و بوئے ز جمشید و پرویز و بہرام جوئے
کہ از بادہ تا چہرہ افروختند دل دشمن و چشم بد سوختند
نہ از من کہ از تاب مے گاہ گاہ بدریوزہ رخ کردہ باشم سیاہ
نہ بستانسرائے نہ میخانہ نہ دستانسرائے نہ جانانہ
نہ رقص پری پیکراں بر بساط نہ غوغائے رامشگراں در رباط
شبانگہ مے رہنمونم شدے سحر گہ طلبگار خونم شدے
تمنائے معشوقہ و بادہ نوش تقاضائے بیہودہ میفروش

چہ گویم چو ہنگام گفتن گزشت ز عمر گرانمایہ بر من گزشت
بسا روزگاراں بدلدادگی بنو بہاراں بہ بے بادگی
بسا روز ابر و شبہائے ماہ کہ بودست بے مے بچشمم سیاہ
افقہا پر از ابر بہمن بہی سفالینہ جام من از مے تہی
بہاراں و من در غم برگ و ساز در خانہ از بے نوائی فراز
جہاں از گل و لالہ پر بوئے و رنگ من و حجرہ و دامنے زیر سنگ

اگر تافتم رشتۂ گوہر شکست — دگر یافتم بادہ ساغر شکست
چہ خواہی ز دلق مے آلود من — ببیں جسم خمیازہ فرسود من

نہ بخشندہ شاہے کہ بارم دہد — بہر بار زر بیل بارم دہد
نہ نازک نگارے کہ نازش کشم — بہر بوسہ زلف درازش کشم

ہنوزم ہماں دل بجوش اندر است — ز دل بانگ خونم بگوش اندر است
چو آں نامرادی بیاد آیدم — بفردوس ہم دل نیاسایدم
دلے را کہ کمتر شکیبد بباغ — در آتش چہ سوزی بہ سوزندہ داغ
صبوحی خورم گر شراب طہور — کجا زہرۂ صبح و جام بلور
دم شبروی ہائے مستانہ کو — ہنگامہ غوغائے مستانہ کو
دراں پاک میخانۂ بے خروش — چہ گنجائی شورش نائے و نوش
سیہ مستیِ ابر و باراں کجا — خزاں چوں نباشد بہاراں کجا

اگر حور، در دل خیالش کہ چہ — غم ہجر و ذوقِ وصالش کہ چہ
چہ منت نہد ناشناسا نگار — چہ لذت دہد وصل بے انتظار
گریزد دم بوسہ انیش کجا — فریبد بہ سوگند و نیشش کجا
نظربازی و ذوقِ دیدار کو — بفردوس روزن بدیوار کو
ز چشم آرزومندِ دلالۂ — نہ دل تشنۂ راہ پرکالۂ

ازینہا کہ پیوستہ میخواست دل — ہنوزم ہماں حسرت آلاست دل

بہر جرم کز روئے دفتر رسد ز من حسرتے در برابر رسد

بعذرہائے کیں داوری چوں بود کہ از جرم حسرت افزوں بود

غالب کا معیارِ سخن

(اقتباسات از دیوان غالب نسخہ عرشی)

تتبع اساتذہ میرزا صاحب اساتذۂ زبان کے پیرو تھے، گو اردو کے بارے میں انھوں نے اپنے متعلق کہا ہے کہ:- "اس امر کے مالک اور اہل زبان ہم ہیں" لیکن نواب علی بہادر، والی باندہ کو یہی مشورہ دیا ہے کہ" از ریختہ گویان گفتارِ میر و میرزا۔ در نظر داشتہ باشند[1]"۔

فارسی میں خود بھی اہل زبان سے استناد کرتے ہیں اور شاگردوں کو بھی اسی کی ہدایت فرماتے ہیں کہ:- "لغت فارسی اور روزمرہ، فارسی ہو، تو اہل زبان کے کلام سے سند کریں[2]۔" اور اس امر میں اپنے معاصرین سے استفادے کو بھی موجب عار نہیں جانتے۔

سرور کو لکھا ہے:-

"حضرت کو یہ معلوم رہے کہ میں اہل زبان کا پیرو اور ہندیوں میں سوائے امیر خسرو دہلوی کے سب کا منکر ہوں جب تک قدما یا متاخرین میں مثل صائب و کلیم و اسیر و حزیں کے کلام میں کوئی لفظ یا ترکیب نہیں دیکھ لیتا، اُس کو نظم اور نثر میں نہیں لکھتا۔

جن لوگوں کے محقق ہونے پر اتفاق ہے جیسو رکو، اُن کا حال کیا گزارش کروں؟ ـــــ ایک اس میں "برہانِ قاطع" ہے۔"

---

[1] کلیات نثر: پنج آہنگ ۲۳۲ ـــــ [2] خطوط:- ۱/۱۸۳

میرزا تفتہ کو تحریر کرتے ہیں[لہ]۔

"اہلِ ہند میں سوائے خسرو دہلوی کے کوئی مسلم الثبوت نہیں۔ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔ فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے، جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا، وہ لکھ دیا۔ نظامی و سعدی وغیرہ کی لکھی ہوئی فرہنگ ہو، تو ہم اس کو مانیں، ہندیوں کو کیوں مسلم الثبوت جانیں؟۔"

بیخبر کو لکھا ہے[تہ]

"فقیر نے اساتذہ کے کلام میں کہیں یہ ترکیب نہیں دیکھی۔ آپ جب تک کلام اہلِ زبان میں نہ دیکھ لیں، اس کو جائز نہ جانیے گا۔ مگر کلام سعدی و نظامی و حزیں اور ان کے امثال و نظائر کا معتمد علیہ ہے، نہ آرزو اور واقف اور قتیل وغیرہم کا۔"

ایک اور خط میں پھر سرور کو لکھا ہے[سہ]۔

"ہندوستان کے سخنوروں میں حضرت امیر خسرو دہلوی علیہ الرحمہ کے سوا کوئی استاد مسلم الثبوت نہیں ہوا، خیر، فیضی بھی نغز گوئی میں مشہور ہے کلام اس کا پسندیدۂ جمہور ہے۔

منت اور مکین اور واقف اور قتیل، یہ تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کا نام لیجیے۔ کلام میں ان کے مزا کہاں؟ ایرانیوں کی سی ادا کہاں؟ فارسی کی قاعدہ دانی میں اگر کلام ہے، اس میں پیروی قیاس وبائے عام ہے۔ دراستہ سیالکوٹی نے خان آرزو کی تحقیق پر سو جگہ

لہ اردو ۳۵۹، لاہور ایڈیشن خطوط ۱۰۰۱ تہ عودہ ۱۳۳ ۔ سہ عود ۳۸ ۔

اعتراض کیا ہے، اور ہر اعتراض بجا ہے، بایں ہمہ، وہ بھی جہاں اپنے قیاس پر جاتا ہے، منہ کی کھاتا ہے۔ مولوی احسان اللہ ممتاز کو صنایع لفظی میں دست گاہ اچھی تھی۔ اور شیوہ درویشی کو خوب برت گئے۔ فارسی وہ کیا جانیں۔ قاضی محمد صادق اختر عالم ہوں گے۔ شاعری سے اُن کو کیا سروکار!

راہِ سخن کے غول

ہندی شاعروں اور ادیبوں کا نام میرزا صاحب نے راہِ سخن کے غول رکھا تھا۔ خلیفہ شاہ محمد، مادھو رام غنیمت اور قتیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نواب انورالدولہ بہادر شفق کو لکھا ہے[1]:

"یہ لوگ راہِ سخن کے غول ہیں، آدمی کے گمراہ کرنے والے۔ یہ فارسی کو کیا جانیں، ہاں طبع موزوں رکھتے تھے، شعر کہتے تھے۔

بر رہ مشتاب و پئے جادہ شناساں بردار
اے کہ در راہِ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت"

اصل الاصول

اُن کی رائے میں فارسی کی تکمیل کے واسطے اصل الاصول مناسبت، طبیعت اور تتبع کلام اہلِ زبان ہے سرور کو ایک خط میں لکھتے ہیں[2]:

"فارسی کی تکمیل کے واسطے اصل الاصول مناسبت طبیعت کی ہے، پھر تتبع کلام اہلِ زبان۔ لیکن نہ اشعار قتیل و واقف۔ جب رودکی و عنصری و خاقانی و رشید وطواط اور ان کے امثال و نظائر کا کلام

---

[1] اردوئے معلیٰ ۲۹۹۔ [2] ایضاً م

بالاستیفا دیکھا جائے، اور ان کی ترکیبوں سے آشنائی بہم پہونچے، اور
ذہن اخوجاج کی طرف نہ لیجائے، تب آدمی جانتا ہے کہ فارسی
یہ ہے۔"

نواب علی بہادر کو اصلاح اشعار کے سلسلہ میں ازراہ نصیحت لکھا ہے[1]

"اگر چہ دانش اسی راز و محرومی پرندۂ اسی ساز آرزو دارند، از رکینہ
گویان گفتار میر و میرزا، و از زمرۂ پارسی گویان، کلام صائب و عرفی و
نظیری و حزین در نظر داشتہ باشند، نہ در نظر داشتنی کہ سواد ورق از
دیدہ بدل نیاید، بلکہ ہمہ کوشش در آن دود کہ جوہر لفظ را بشناسند و
نہ در نظر ما بنگرند و سرہ را از ناسرہ جدا کنند۔"

تتبع لہجہ

اسی طرح وہ اس کو بھی ناپسند کرتے تھے کہ اہل ایران کے لہجہ کا اتباع کیا جائے کہ یہ ایک خلقی وصف ہے۔ اور اسلیے ناقابل تتبع ہے۔ چنانچہ قدر بلگرامی کو لکھا ہے[2]

"تحریر میں اساتذہ کا تتبع کرو، نہ مغل کے لہجہ کا۔ لہجہ کا تتبع بھانڈوں کا کام ہے، نہ دبیروں اور شاعروں کا ایسے تتبع کو میرا سلام۔"

آغاز شعر گوئی

میرزا صاحب نے ابتدائی سن تمیز ہی سے شعر گوئی شروع کر دی تھی۔ مگر اُس وقت کیا عمر تھی، اس بارے میں خود اُن کے بیان میں اختلاف ہے، کلیات فارسی کے خاتمہ میں تحریر فرماتے ہیں[3]

"اور روزی کہ شمارۂ سنین عمر از آحاد فرا ترک رفت، در رشتۂ حساب
زحمت یازدہمین گرہ نجہ در گرفت، اندیشہ در روا بود گام فراق بر داشت

۱؎ کلیات نثر، پنج آہنگ ص ۲۳۲ ۲؎ ایضاً ۱/۱۷۹ ۳؎ کلیات ص ۵۵۳

دکر بود دمغاک بادیۂ سخن پیمودن آغاز نہاد۔"

سلطان غلام محمد بہادر کو لکھتے ہیں[50]

"در دہ سالگی آثار موزونی طبع گرفت۔"

قدر بلگرامی کو ۱۸۶۵ء میں تحریر کیا ہے[51]۔

"بارہ برس کی عمر سے کاغذ، نظم و نثر میں مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں۔ باسٹھ برس کی عمر ہوئی۔ پچاس برس اس شیوے کی ورزش میں گزرے۔"

شاکر کو بھی یہی تخمینہ تحریر فرماتے ہیں[52]۔

"۱۵ برس کی عمر سے ۲۵ برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔"

ان بیانوں کے پیش نظر، میرزا صاحب کی سخن سرائی کا آغاز ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۷ء)۔ ۱۲۲۳ھ (۱۸۰۸ء) اور ۱۲۲۴ھ (۱۸۰۹ء) میں سے کسی ایک سال ہوا تھا۔ ان میں سے راجح قول یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ تقریباً دس برس کی عمر سے شعر گو تھے، کیونکہ کلیات فارسی کا اظہار، جو سب سے قدیم ہے یہی ثابت کرتا ہے، اور اس کی تائید اُن کے ہمجولی لالہ کنہیا لال کے بیان سے ہوتی ہے جسے خواجہ حالی مرحوم نے نقل کیا ہے[53]۔

ریختہ گوئی۔ پہلا دور میرزا صاحب کی شاعری کا آغاز ریختہ سے ہوا تھا گل رعنا کے دیباچے میں فرماتے ہیں[54]

"در آغاز رخار رخار جگر کاوی شوتم ہمہ صرف نگارش اشعار اردو زبان بود۔"

ناسخ کو لکھتے ہیں[55]۔

---

[50] کلیات نثر، پنج آہنگ ص ۲۴۹ [51] خطوط ص ۱۷۷، [52] ایضاً ص ۱۹۸، [53] عود ص ۱۵۹
[54] یادگار غالب ص ۱۰۷ [55] کلیات نثر پنج آہنگ ۵۹۔

"خاکسار نے ابتدائی سن تمیز میں اردو زبان میں سخن سرائی کی ہے۔"

۲۵ سال کی عمر تک زیادہ تر اردو ہی میں کہتے رہے۔ بعد ازاں فارسی زبان سے فطری لگاؤ کی بنا پر فارسی میں کہنے لگے۔ شاکر کو تحریر کیا ہے۔[۴]

"۱۵ برس کی عمر سے ۲۵ برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا، دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔"

نواب شمس الامرا کو رقمطراز ہیں۔[۵]

"تا بپارسی زبان ذوق سخن یافتہ، ازاں دادی عنان اندیشہ برتافتہ ...... کا ہش سی سال ست، کہ اندیشہ پارسی سگال ست۔"

یہ خط اپریل ۱۸۵۳ء سے پہلے لکھا گیا تھا۔ کتاب خانۂ رام پور میں "پنج آہنگ" کا مطبوعہ نسخہ محفوظ ہے جو مذکورہ بالا تاریخ کو دہلی کے مطبع دار السلام سے چھپ کر شایع ہوا تھا۔ اس ایڈیشن میں یہ خط شامل ہے اور اس میں غالب نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ گزشتہ ۳۰ سال سے فارسی میں فکر سخن کرتے ہیں۔ اگر ہم اسے ۱۸۵۲ء کا تسلیم کر کے مجموعہ میں سے ۳۰ سال وضع کر دیں تو ریختہ گوئی کے خاتمہ اور پارسی سگالی کے آغاز کا سال ۱۸۲۲ء قرار پائے گا۔ اور چونکہ وہ ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے تھے، اس لیے اس وقت اُن کی عمر ۲۵ سال کی ہوگی جو شاکر کے نام کے خط میں ذکر کی جا چکی ہے۔

ریختہ گوئی:- دوسرا دور

۲۵ سال کی عمر کے بعد میرزا صاحب فارسی زبان کی نظم و نثر کی طرف زیادہ متوجہ ہو گئے۔ اس زمانہ میں، ریختہ کہنے کا بھی اتفاق ہوا، لیکن فارسی کے مقابلہ میں اُس کی

---

[۴] عود ۱۵۹ - [۵] کلیات نثر، پنج آہنگ ص ۳۰۸

مقدار نہ ہونے کے برابر ہے اسی لیے انھوں نے اس پوری مدت میں آپ کو "فارسی نگار" کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

۱۸۵۰ء میں قلعہ سے تعلق پیدا ہوا، تو شاہ ظفر کی بدولت اُن کی ریختہ گوئی نے دوبارہ جنم لیا اور شاہی مشاعروں کے لیے مختلف طرحوں میں طبع آزمائی کرنے لگے۔

غدر کے بعد دلی پر آلام و مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بادشاہ جلا وطن کیے گئے اور اُن کے ہوا خواہ شہر بشہر مارے مارے پھرنے لگے۔ میرزا صاحب کا دل ٹوٹ گیا اور وہ شعر و شاعری کو خیر باد کہہ کر زندگی کے دن پورے کرنے لگے۔ تاہم اس زمانہ میں بھی صاحبانِ کرم کے خیال سے کچھ کہنا پڑتا تھا، لیکن ایسے اشعار کی تعداد بہت تھوڑی ہے، اس لیے انھیں پچھلے دور کا تتمہ خیال کرنا چاہیے۔

فارسی نگاری | اگرچہ میرزا صاحب نے ابتدائی سن تمیز میں اردو زبان میں سخن سرائی کی، لیکن وہ آغاز ہی سے نظم و نثر فارسی کے عاشق تھے۔ اس لیے اُن کا ابتدائی اردو کلام، تخئیل اور الفاظ دونوں میں فارسی کہلانے کا زیادہ مستحق ہے۔

بقول خود وہ پچیس سال کی عمر تک، بیدل، شوکت اور اسیر کی طرز پر ریختہ لکھتے رہے۔ تمیز آنے پر طبیعت نے اس خارزار سے باہر نکلنے کی تدبیر سجھائی اور اُنھوں نے نظیری، عرفی وغیرہ خداوندانِ سخن کے کلام کا مطالعہ کر کے، اُن کی راہ پر گام زنی شروع کی۔

تعریفِ سخن | میرزا صاحب سخن کی تعریف میں فرماتے ہیں[۱]: سخن ....

---

[۱] کلیاتِ نثر، پنج آہنگ، ص ۳۰۷

گراں ارز متاع عالم قدس است؛

اس متاع قدس کو قدرت نے کیا کچھ اوصاف عطا کیے ہیں، اس کے متعلق دیباچہ دیوان فارسی میں لکھتے ہیں[1]:

"سخن را دو شیزگی نہاد، و پاکیزگی گوہر، و برجستگی مضمون دگداختگی نفس و جاں تنگی پاس و نمک شکوہ و نشاط نغمہ، و اندوہ شیون، و روائی کار و رسائی بار، و پردہ کشائی راز، و جلوہ فروشی نوید و سازگاری آرزو، و دلخراشی نکوہش، و ہمواری صلا، و درشتی دور باش، و گزارش دعدہ، و سپارش پیام، و ابر نامۂ بزم، و ہنگامۂ رزم حاصل؛"

تعریف شعر

لیکن محفل ادب میں جس "سخن" کو بار حاصل ہے، وہ ایک معشوقہ پری پیکر ہی ہے، تقطیع شعر اُس کا لباس اور مضامین اُس کا زیور ہے۔ دیدہ وروں نے شاہد سخن کو اس لباس اور اس زیور میں رونق رُخ تمام پایا ہے؛

اس شاہد کی تعریف، اس کے مدارج حسن اور اختلاف روش و طرز سخن گوئی اور اُس کے داخلی و خارجی اوصاف کی تاثیر کے متعلق فرماتے ہیں[2]

"گفتار موزوں کہ آں را شعر نامند در ہر دل جائے دیگر، و در ہر دیدہ رنگی دیگر و سخن سرایان را ہر زمزمہ جنبشی دیگر، و ہر ساز آہنگی دیگر دارد"

لیکن "گفتار موزوں" کے الفاظ میں قدرے ابہام تھا، جس سے کچھ لوگ دماغ گمراہ ہوگئے تھے، اس لیے مزید صراحت کرتے ہیں کہ[3] "شاعری معنی آفرینی ہے، قافیہ پیمائی نہیں ہے۔"

---

[1] کلیات فارسی ص ۳ [2] کلیات نثر، پنج آہنگ ص ۲۲۲ [3] خطوط ج ۱، ۸۴۰

اوصافِ شعر

میرزا صاحب کے حسب ذیل بیانات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُن کے نزدیک شعر کے لیے کیا اوصاف درکار ہیں ایک قصیدہ کی تعریف میں لکھتے ہیں[1]

"ہزار آفریں، کیا اچھا قصیدہ لکھا ہے! واہ، واہ! چشم بد دور! تسلسل معانی سلاست الفاظ"

مہر کے قصیدہ کے متعلق فرماتے ہیں[2]

"انشاء اللہ خاں بابھی قصیدہ میں نے دیکھا ہے، تم نے بہت بڑھ کر لکھا ہے اور اچھا سماں باندھا ہے۔ زبان، پاکیزہ، مضامین، اچھوتے معانی نازک، مطالب کا بیان دلنشین۔

شفق کی ایک فارسی غزل کے متعلق تحریر کیا ہے[3]۔

"کیا پاکیزہ زبان ہے، اور کیا طرز بیان!"

بیخبر کی غزل کی داد دیتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے[4]

"رام پور ہی میں تھا کہ اودھ اخبار میں حضرت کی غزل نظر فروز ہوئی۔ کیا کہنا ہے۔" ابداع " اس کو کہتے ہیں۔ "جدت طرز" اس کا نام ہے۔ جو ڈھنگ تازہ ایران ایران کے خیال میں نہ گزرا تھا، وہ تم بروئے کار لائے ہو۔"

قہر کی غزل کی داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں[5]۔

"سحر ہو گی، خبر ہو گی، اس زمین میں وہ شعر نعیں۔

---

[1] خطوط ۱۰۹۱ - [2] اردوئے معلیٰ ۲۶۵، خطوط ۲۹۸۱ - [3] اردوئے معلیٰ ۳۱۳ عود ۵۴، خطوط ۳۲۱۰۱، [4] اردوئے معلیٰ ۲۷۹، خطوط ۲۹۸۱، [5] اردوئے معلیٰ ۲۶۸ عود ۱۱۱، خطوط ۳۰۵۱

تمہارے واسطے دل سے مکاں کوئی نہیں بہتر
جو آنکھوں میں مکیں رکھوں تو ڈرتا ہوں نظر ہوگی

کتنا خوب ہے، اور ردیف کا کیا اچھا اسلوب ہے!"

مہر کی مثنوی کے بارے میں فرماتے ہیں[1]

"مثنوی پہونچی، جھوٹ بولنا میرا شعار نہیں، کیا خوب بول چال ہے!
انداز اچھا، بیان اچھا، روزمرہ صاف۔ مجنوں کا استغاثہ، کیا
کہوں کیا مزہ دے رہا ہے!"

تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں[2]

"یہ جو تم نے التزام کیا ہے ترصیع کی صنعت کا اور دو لخت شعر کہنے کا
اس میں ضرور نشست بھی ملحوظ رکھا کرو۔"

اپنی ایک غزل کے متعلق ناسخ لکھنوی کو تحریر کیا ہے[3]

"غزلی کہ اندریں روزہا بتازگی در روش تازہ گفتہ ام، بعد
عذر خواہی تقصیر کوتہ قلمی بر حاشیہ مکتوب می نگارم۔"

امیر اللہ سرور کو حیدر علی اشجع کی غزل کے متعلق لکھتے ہیں[4]

"روشنی پسندیدہ و طرزی گزیدہ دارد، دہمیں است شیوۂ مکرمی شیخ امام بخش
ناسخ و خواجہ حیدر علی آتش و دیگر تازہ خیالان لکھنؤ۔"

سرور کے ایک شعر کی ان الفاظ میں داد دیتے ہیں[5]

"رجب علی بیگ نے "جو فسانۂ عجائب" لکھا ہے، آغاز داستان کا شعر
اب مجھ کو بہت مزا دیتا ہے۔"

---

[1] اردوئے معلیٰ ۸۰ [2] عود ۱۱۷، خطوط ۱، ۱۹۰ [3] خطوط ۱، ۱۸۱ [4] کلیات نثر، پنج آہنگ ۱۱۳ [5] ایضاً ۱۲۵ [6] اردوئے معلیٰ ۱۰۵، خطوط ۱، ۳۰۸

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ یاد رکھنا، فسانہ ہیں ہم لوگ

مصرعۂ ثانی کتنا گرم ہے، اور یاد رکھنا، فسانے کے واسطے کتنا مناسب"

نواب باندہ کے اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں[1]

"زہی لطفِ طبع، وحدتِ ذہن، و سلامتِ فکر، و حسنِ بیان، ہرگاہ در آغاز چنیں بودہ اند، بشرطِ دوامِ ورزش و التزامِ مشق، حقا کہ در اندک مایہ مدت علمِ یکتائی خواہند افراشت۔"

جنون بریلوی کو تحریر کیا ہے[2]

"عربی میں تعقید لفظی و معنوی دونوں معیوب ہیں، فارسی میں تعقیدِ معنوی عیب اور تعقیدِ لفظی جائز ہے، بلکہ فصیح اور ملیح۔ ریختہ تقلید ہے فارسی کی۔"

ناسخ مرحوم کے متعلق فرماتے ہیں[3]

"مولانا ناسخ کہ در فنِ طرحِ نوی ریختہ ادست، و ہر ریختہ نقشِ بدیع انگیختہ او"

انھیں کے بارے میں یہ بھی کہا ہے[4]

"سبحان اللہ! سخن بروزگارِ مخدوم بپایۂ بلند رسید، و اردو را رونقِ دیگر پدید آمد"

ناسخ کو لکھا ہے[5]

"شیخ امام بخش طرزِ جدید کے موجد اور پرانی ناہموار روشوں کے ناسخ تھے۔"

خود اپنے کلام کے متعلق ارشاد ہوتا ہے[6]

"میرا فارسی دیوان جو دیکھے گا، وہ جانے گا کہ جلے کے جلے مقدر چھوڑ جاتا ہوں۔"

---

[1] کلیاتِ نثر، پنج آہنگ: ۔ ۲۳۲ ۔ [2] خطوط ۱: ۱۲۶ [3] کلیاتِ نثر، پنج آہنگ [4] ایضاً ۱۱۲ [5] اردوئے معلیٰ: ۔ ۲۰۴ ۔ عود ۱۳۵ ۔ [6] خطوط: ۔ ۱: ۲۵

لیکن میرزا صاحب کے نزدیک جملوں کو مقدر چھوڑنے کے لیے ضروری ہے کہ سننے والے کا ذہن حذف شدہ الفاظ کی طرف بسہولت منتقل ہو سکے، ورنہ وہ اس کو عیب شمار کرتے تھے۔ میر مہدی مجروح کو لکھا ہے[1]

"می خواہم از خدا و نمی خواہم از خدا
دیدنِ حبیب را و ندیدنِ رقیب را

لف و نشر مرتب ہے۔ "می خواہم از خدا دیدنِ حبیب و نمی خواہم از خدا دیدنِ رقیب" خوار و زار و خستہ و سوگوار۔"

نساخ کے دیوان پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھا ہے[2]

"میں دروغ گو نہیں، خوشامد میری خو نہیں۔ دیوان فیض عنوان اسم بامسمیٰ ہے۔ دفترِ بے مثال، اس کا نام بجا ہے۔ الفاظ متین، معانی بلند، مضمون عمدہ، بندش دل پسند۔"

عیوبِ شعر محاسن شعر کے ساتھ عیوب پر میرزا صاحب کا نقطۂ نگاہ دریافت کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ جیسا کہ کئی جگہ ذکر کیا گیا ہے، وہ ابتداً بیدل کی پیروی میں کوشش کر کے ایسا خیال نظم کرتے تھے، جو عام دماغوں کی دسترس سے باہر ہو۔ لیکن آخر میں اس سے خود بھی احتراز کرنے لگے تھے اور شاگردوں کو بھی اس سعیِ ناشگور سے باز رکھتے تھے۔ جنون بریلوی کو لکھتے ہیں[3]۔

"قطرۂ مے بس کہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

اس مطلع میں خیال ہے دقیق، اگرکوہ کندن و کاہ برآوردن یعنی، لطف زیادہ نہیں۔"

---

[1] ایضاً:- ۱، ۲۷۰ [2] اردوئے معلیٰ:- ۲۰۴، عودہ:- ۱۲۵ ۔۔۔، عودہ:- ۱۲۵ [3] خطوط:- ۱، ۱۲۵ [4] ایضاً:- ۱، ۱۹۳

اسی طرح میرزا صاحب کو یہ بھی ناپسند تھا کہ مطلع میں تخلص باندھا جائے۔ قدر کو لکھتے ہیں:[۵۱]

"مطلع میں نام اپنا لکھنا رسم نہیں ہے۔ میر کا تخلص اور صورت رکھتا ہے میر جی اور میر صاحب کرکے وہ اپنے کو لکھ جاتا ہے۔ اور کو اس بدعت کا تتبع نہ چاہیئے۔"

دیوان کی پہلی غزل کے مطلع میں حروف و الفاظ کی قید بھی قائل نہ تھے۔ قدر ہی کو لکھا ہے:[۵۲]

"آغاز دیوان کے شعر، یعنی مطلع میں ہرگز حروف و الفاظ کی قید نہیں ہے، ہاں، ردیف الف کی، یہ امر قابل پرستش کے نہیں، بدیہی ہے۔ دیکھ لو اور سمجھ لو۔ یہ جو دیوان مشہور ہیں، حافظ و صائب و سلیم و کلیم، ان کے آغاز کی غزل کے مطلعے دیکھو اور حروف و الفاظ کا مقابلہ کرو، کبھی ایک صورت ایک ترکیب، ایک زمین، ایک بحر نہ پاؤ گے، چہ جائے اتحاد حروف و الفاظ؟ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔"

توارد کے متعلق میرزا صاحب کی یہ رائے تھی کہ اگر پس رو شاعر اپنے پیشرو سے مضمون آفرینی یا طرز ادا میں زیادہ لطف و خوبی پیدا کر دے، تو یہ اُس کے لیے قابل فخر بات ہے۔ میرزا تفتہ کو لکھتے ہیں:[۵۳]

"ایک مصرع میں تم کو محمد اسحاق شوکت بخاری سے توارد ہوا۔ یہ بھی محل فخر و شرف ہے کہ جہاں شوکت پہونچا، وہاں تم پہونچے۔ وہ مصرع یہ ہے:

چاک گردیدیم و از جیب بداماں رفتیم

---

۵۱ ایضاً ۔ ۱، ۱۳۰ ۵۲ ایضاً ۔ ۱، ۱۴۲ ۵۳ خطوط ۔ ۱، ۷۹

پہلا مصرع تمہارا، اگر اُس کے پہلے مصرع سے اچھا ہوتا، تو میرا دل اور زیادہ خوش ہوتا۔"

میرزا صاحب کو خواہ مخواہ قیود کا التزام بھی ناپسند تھا، تفتہ نے شاید اپنے قصاید کو حروفِ تہجی پر مرتب کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ انھیں لکھتے ہیں[۵۱]۔

"خبردار، قصاید بقیدِ حروفِ تہجی نہ جمع کرنا۔"

غالباً کچھ محققِ انگریزی الفاظ نیز اُن مصطلحات کو جو سرکاری دفاتر کی پیداوار تھے یا انگریزی تہذیب و تمدن کی بدولت مروج ہوئے تھے، ٹکسال باہر جانتے تھے اور اپنے روزمرہ میں اُن کے استعمال سے پرہیز کرتے تھے۔ مرزا صاحب نے اس کے متعلق ۱۸۶۵ء میں قدر بلگرامی کو لکھا ہے۔[۵۲]

"چاپی، لغت انگریزی ہے۔ اس زمانہ میں اس اسم کا شعر لانا جائز ہے، بلکہ مزا دیتا ہے۔ تار، بجلی اور دخانی جہاز کے مضامین میں نے اپنے یاروں کو دیئے ہیں، اوروں نے بھی باندھے ہیں۔ روبکاری اور طلبی اور فوجداری اور سررشتہ داری، خود یہ الفاظ میں نے باندھے ہیں۔"

لیکن عام طور پر میرزا صاحب انتخاب الفاظ میں بہت محتاط تھے۔ قاضی عبدالجمیل بریلوی کو ۱۸۶۳ء میں ہدایت کی ہے کہ کائتھوں کی اردو سے بچئے۔ فرماتے ہیں[۵۳]

"گھات میں مدعا برآری کی　　ہم نے غیروں کی غمگساری کی

تقدیم و تاخیر مصرعتین کر کے رہنے دو۔ اس میں کوئی سقم نہیں۔ 'مدعا برآری' کائتھوں کا لفظ ہے۔ میں اس طرح کے الفاظ سے احتراز کرتا ہوں

---

[۵۱] خطوط، ۱، ۹۰۔ [۵۲] خطوط، ۱، ۱۸۸۔ [۵۳] ایضاً، ۱، ۱۲۵۔

مگر چونکہ من حیث المعنی یہ لفظ صحیح ہے، مضائقہ نہیں۔

قصیدے کے آخر میں ایسے الفاظ جو خاتمہ پر دلالت کرتے ہوں، نہ لانے کو بھی میرزا صاحب عیب جانتے تھے ایطا بھی اُن کے نزدیک عیب تھا۔ چنانچہ ایک مکتوب میں تفتہ کو بگڑ کر لکھا ہے[1]۔

"حضرت، اس غزل میں 'دیوانہ'، 'ویرانہ'، 'تجانہ' تین قافیے اصلی ہیں۔ 'دیوانہ' چونکہ علم قرار پا کر ایک لغت جداگانہ مشخص ہو گیا ہے، اس کو بھی قافیۂ اصلی سمجھ لیجیے۔ باقی 'غلامانہ'، 'مستانہ'، 'مردانہ'، 'ترکانہ'، 'دلیرانہ'، 'شکرانہ'، سب ناجائز و نامستحسن، ایطا اور ایطا بھی قبیح ..... یاد رہے ساری غزل میں 'مردانہ'، یا 'مستانہ'، یا ان کے نظائر میں سے ایک جگہ آوے، دوسری بیت میں زنہار نہ آوے۔ یہ غزل نظر ہو گئی۔"

غزل کے اشعار کی زائد تعداد بھی پسند نہ تھی۔ فرماتے ہیں[2]

"ایک بات اور تمھارے خیال میں رہے، میری غزل پندرہ سولہ بیت کی بہت شاذ و نادر ہے؛ بارہ بیت سے زیادہ اور نو شعر سے کم نہیں ہوتی۔"

میزان شعر میرزا صاحب نے ایک میزان شعر مقرر کر دی تھی تاکہ اُس پر فارسی و اردو کے تمام شاعروں کے کلام کو پرکھا جا سکے۔ میزان یہ ہے۔

(۱) رودکی و فردوسی سے لے کر خاقانی و سنائی و انوری وغیرہم تک ایک گروہ۔ ان حضرات کا کلام تھوڑے تھوڑے تفاوت سے ایک وضع پر ہے۔

---

[1] ایضاً۔ ۱، ۹۸ [2] اردوئے معلی۔ ۳۰۹، خطوط۔ ۱، ۳۹۳

(۲) پھر حضرت سعدی طرز خاص کے موجد ہوئے۔ سعدی و جامی و ہلالی، یہ اشخاص متعدد نہیں۔

(۳) فغانی ایک اور شیوۂ خاص کا مبدع ہوا۔ خیالہائے نازک و معانی بلند لایا۔ اس شیوے کی تکمیل کی ظہوری و نظیری و عرفی و نوعی نے۔ سبحان اللہ قالب سخن میں جان پڑ گئی۔

(۴) اس روش کو بعد اس کے صاحبان طبع نے سلاست کا چربا دیا۔ صائب و کلیم و سلیم و قدسی و حکیم شفائی، اس زمرے میں ہیں۔ رودکی و اسدی و فردوسی، یہ شیوہ سعدی کے وقت میں ترک ہوا، اور سعدی کی طرز نے، بسبب سہل ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا۔ فغانی کا انداز پھیلا، اور اُس میں نئے نئے رنگ پیدا ہوتے گئے۔ تو اب طرزیں تین ٹھہریں۔

(۱) خاقانی، اُس کے اقران۔ (۲) ظہوری، اُس کے امثال۔ (۳) صائب، اُس کے نظایر۔

خالصاً للہ! ممتاز و اختر و غیرہم کا کلام، ان تینوں طرزوں میں کس طرز پر ہے؟ بے شبہ فرماؤگے کہ یہ طرز اور ہی ہے۔ پس تو ہم نے جانا یہ طرز چوتھی ہے کیا کہنا ہے! خوب طرز ہے! اچھی طرز ہے دیگر فارسی نہیں ہے، ہندی ہے دار الضرب شاہی کا سکہ نہیں ہے۔ ٹکسال باہر ہے۔ داد، داد!، انصاف انصاف!

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار ز یک جام اند در بزم سخن مست
ولے با بادۂ بعضی حریفاں خمار چشم ساقی نیز پیوست
مشو منکر، کہ در اشعار ایں قوم ورائے شاعری "چیزے دگر" ہست

وہ "چیزے دگر" پارسیوں کے حصہ میں آئی ہے۔ ہاں، اردو زبان میں اہل ہند نے وہ چیز پائی ہے۔ میر تقی، علیہ الرحمۃ۔

بدنام ہوگے جانے بھی دو امتحان کو — رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

سوداؔ:- دکھلائیے لیجا کے تجھے مصر کا بازار — خواہاں نہیں، لیکن، کوئی واں جنس گراں کا

قائمؔ:- قائم اور تجھ سے طلب بوسہ کی کیونکر مانوں! — ہے تو ناداں، مگر اتنا بھی بدآموز نہیں

مومن خاں:- تم مرے پاس ہوتے ہو گویا! — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ناسخؔ کے ہاں اکثر اور آتشؔ کے ہاں بیشتر، یہ تیر و نشتر ہیں۔ مگر مجھے اُن کا کوئی شعر اس وقت یاد نہیں آتا۔

اس طرز گفتار کا نام میرزا صاحب نے "شیوا بیانی" رکھا تھا، اور شیوا بیان شاعر کے لیے ان چار اوصاف کو لازم قرار دیا تھا[۱]

"سخن عشق و عشق سخن، کلام حسن و حسن کلام"

سہل ممتنع

اگر مذکورہ بالا اوصاف کو ایک جامع و مانع لفظ سے ادا کرنا چاہیں، تو کہہ سکتے ہیں کہ شعر کی خوبی اور اُس کا حُسن یہ ہے کہ "سہل ممتنع" ہو۔ میرزا صاحب نے بھی اسی صفت کو حسنِ بیان کی معراج قرار دیا ہے فرماتے ہیں[۲]:-

"سہل ممتنع اُس نظم کو کہتے ہیں کہ دیکھنے میں آسان نظر آئے اور اس کا جواب نہ ہو سکے۔ بالجملہ سہل ممتنع، کمالِ حسنِ کلام ہے اور بلاغت کی نہایت ہے۔ ممتنع، درحقیقت ممتنع النظیر ہے۔

شیخ سعدیؔ کے بیشتر فقرے اس صفت پر مشتمل ہیں اور رشید وطواط وغیرہ شعرائے سلف نظم میں اس شیوے کی رعایت منظور رکھتے ہیں۔

خودستائی ہوتی ہو۔ سخن فہم اگر غور کرے گا، تو فقیر کی نظم و نثر میں

---

[۱] کلیات نثر ص ۳۰۸۔ [۲] عود ہندی ص ۱۳۰۔

سہل ممتنع اکثر پائے گا۔

اپنے اشعار کے متعلق مرزا صاحب کا یہ خیال اتنا پختہ ہو گیا تھا کہ وہ اُسے عام ریختہ اشعار سے جداگانہ قسم کا کلام مانتے تھے اور میر و میرزا کے کلام سے بھی بالاتر سمجھتے تھے۔ چنانچہ منشی نبی بخش حقیر کو یہ غزل

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں ۔۔۔ خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں!

بھیجی، تو اس کے ساتھ یہ بھی لکھا[1]

"خدا کے واسطے داد دینا! اگر ریختہ یہ ہے، تو میر و میرزا کیا کہتے تھے؟ اگر وہ ریختہ تھا، تو پھر یہ کیا ہے؟"

اور اتنا ہی نہیں، بلکہ اپنے اشعار ریختہ کو مذہبی اصطلاح میں سحر یا اعجاز بھی قرار دیتے تھے۔ چنانچہ انھیں حقیر کو یہ غزل۔

کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مو آئے ۔۔۔ یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے

بھیجتے ہوئے ستفسرانہ لکھا ہے[2]۔

"داد دینا کہ اگر ریختہ پایۂ سحر یا اعجاز کو پہونچے، تو اس کی صورت یہی ہو گی یا کچھ اور؟"

۲۔ کھلبلی یا مدح

جو نقادِ مشرقی دربار کے سماجی اثرات سے واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ شعرائے مشرق کے لیے سلاطین کی مدح سے راہ گریز نہ تھی اور شاہی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہر شاعر کو الفاظ و معانی کے باغ لگانا پڑتے تھے۔

یہی جذبۂ افسوس ہے جس کے تحت وہ مدح کے اشعار نسبتاً کم لکھتے اور تشبیب

---

[1] نادرات ص ۲۶ [2] ایضاً ص ۱۲۔

عرضِ حال وغیرہ پر زیادہ زور دیتے ہیں تاکہ مدح اپنے حدود سے گزر کر بھیک نہ بن جائے۔ تاہم انھوں نے مجبوراً کھٹنی بھی کی۔

لیکن انھیں دواعی اسباب کے تحت جو اُن کے پیشروؤں کو لاحق ہوئے تھے۔ یعنی جس نے کچھ دیا، یا جس سے کچھ ملنے کی اُمید بندھی، اُس کی شان میں قصیدہ لکھا، اور جب یہ اُمید ٹوٹ گئی، اس رسم کو بند کر دیا۔ ظاہر ہے کہ کھٹنی ہی تھی۔ اسی لیے ۱۸۶۰ء میں علائی کے نام کے خط میں اس کا خود بھی اعتراف کیا ہے۔ فرماتے ہیں[1]۔

"اشعار تازہ مانگتے ہو۔ کہاں سے لاؤں؟ عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بعد ہے جو ایمان سے کفر کو۔ گورنمنٹ کا بھاٹ تھا۔ کھٹنی کرتا تھا۔ خلعت موقوف، کھٹنی متروک۔ نہ غزل نہ مدح۔"

ہزل و ہجو

میرزا صاحب کی سنجیدگی و خودداری نے اُن کے رواں دواں دماغ کو شاعری کی بلند سطح سے اترنے کی اجازت نہیں دی۔ اسی لیے وہ بڑی حد تک ہزل و ہجو سے اپنا دامن بچا لے گئے۔ خود بھی فرماتے ہیں[2]

"ہزل و ہجو میرا آئین نہیں۔"

تاہم اُن کے کلامِ فارسی میں متعدد ہجویہ قطعات موجود ہیں۔ ان میں سے صرف ایک مطالعہ اُن کا اندازِ ہجو معلوم کرنے کے لیے کافی ہوگا۔ فرماتے ہیں[3]۔

کردہ جہدے کہ در ویرانی کاشانہ ام	چرخ در آرایش ہنگامۂ عالم نکرد
گریہ ہجوت راندہ باشم نکتہ ہا، برخود مپیچ	زانکہ حرفے زانچہ گفتم، خاطرم خرم نکرد

---

[1] اردوئے معلیٰ ص ۳۵۹ خطوط ۱-۱۰۲۱ [2] ایضاً ص ۳۲ [3] کلیاتِ فارسی ج ۱- ۱۷

بیتے از استاد دیدم، ذوقِ نگی بخشید، لیک　　ہیچ در تلقین بیغزود و ز وحشت کم نکرد
"ہمچو تو ناقابلے در صلبِ آدم دیدہ بود　　زاں سبب ابلیسِ ملعون سجدہ بر آدم نکرد

حاشا للہ، بودنت در صلبِ آدم تہمت است
جنبشِ ہر کس نگفتم ایں اندیشہ، باور ہم نکرد

اس سے بجا طور پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے انتہائی غم و غصے کے تحت دو چار اشخاص کی مذمت کر دی تھی۔ اس روش کو دوسرے شعرا کی طرح اپنا آئین نہیں بنایا۔ علاوہ ازیں ان میں کسی شخص کا نام بھی نہیں لیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب کا مقصود صرف دل کی بھڑاس نکالنا تھا، کسی کو بدنام کرنے اور بدنام رکھنے کے لیے ہجو پر شعر نہیں کہے تھے۔

ترکِ شعر گوئی

میرزا صاحب نے تقریباً ۱۸۶۱ء میں سرور کو لکھا ہے[۱]

"میں اموات میں ہوں۔ مردہ شعر کیا کہے گا۔ غزل کا ڈھنگ بھول گیا۔ معشوق کس کو قرار دوں جو غزل کی روش ضمیر میں آئے؟ رہا قصیدہ، ممدوح کون ہے؟ ہائے! انوری گویا میری زبان سے کہتا ہے

اے دریغا نیست ممدوحی سزاوارِ مدیح　　اے دریغا نیست معشوقی سزاوارِ غزل

صناعتِ شعر اعضا و جوارح کا کام نہیں، دل چاہیے۔ دماغ چاہیے۔ ذوق چاہیے، امنگ چاہیے، یہ سامان کہاں سے لاؤں جو شعر کہوں، چونسٹھ برس کی عمر، ولولۂ شباب کہاں؟ رعایتِ فن، اُس کے اسباب کہاں؟"

۴ مارچ ۱۸۶۶ء کو تفتہ کے خط میں لکھا ہے[۲]

۱؎ اردوئے معلیٰ ص ۱۳۸، عود ۳۲　۲؎ خطوط ج ۱، ص ۸۷

"شعر کام دل و دماغ کا ہے، وہ روپے کی فکر میں پریشان۔"

واقعہ یہ ہے کہ جب تک میرزا صاحب مالی پریشانیوں میں مبتلا نہ ہوئے تھے انھیں آزاد دل و دماغ، سرمستانہ ذوق شعر اور طبیعت کی جدت پسند امنگ حاصل تھی۔

میرزا صاحب کی اس پرکیف زندگی کا خاتمہ پنشن کے مقدمے کے آغاز پر ہو گیا۔ تاہم ابھی اُن کی شاعری کا شباب ولولہ و مستی سے بیگانہ نہیں ہوا تھا۔ ہاں، جب کلکتہ سے ناکام واپس ہوئے اور پھر جنوری ۱۸۳۱ء میں مقدمہ اُن کے خلاف فیصل ہوا، تو مستقبل کے خوفناک تصور نے اُن کے دل و دماغ کو سخت اذیت پہونچائی اور پہلی بار اُن کی طبیعت نے فکر شعر و سخن سے تنفر کا اظہار کیا۔ اب وہ غزل کہتے تھے، مگر دوستوں کے اصرار پر، اور قصاید بھی لکھتے تھے، مگر مالی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے۔

۱۸۵۰ء میں قلعۂ معلیٰ سے تعلق قائم ہوا تو میرزا صاحب کی شاعری میں پھر حرکت محسوس ہوئی، لیکن کچھ تو پژمردگی طبع کی وجہ سے اور زیادہ تر شاہ ظفر کے مذاق سخن کے اتباع میں انھوں نے اردو زبان میں زاید کہا۔ تاہم جو طبیعت افسردہ ہو کر مردہ ہو چلی تھی، اور جو دماغ جوانی سے گزر کر پیری کے حدود میں داخل ہو گیا تھا، وہ دوسروں کے سہارے کہاں تک ہمت اور جوش کا مظاہرہ کر سکتا تھا، میرزا صاحب نے اس زمانہ میں بہت کچھ کہا، اور خوب خوب کہا۔ مگر یہ سب مجبوری سے کہا، اگر وہ اپنے آپ کو مالی مشکلات میں گرفتار نہ پاتے، تو کبھی اس مشقت کو برداشت نہ کرتے۔ ۲۸ ستمبر ۱۸۵۵ء کو حقیر کو لکھتے ہیں:[1]

---

[1] نادراتِ غالب ص ۸۰

"میں نے قصیدہ لکھنا موقوف کیا کیا، مجھ سے لکھا ہی نہیں جاتا...

افسوس! تم کو میرے حال کی خبر نہیں۔ اگر دیکھو تو جانو۔ ع:

"جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا" کوئی دم ایسا نہیں ہے کہ

مجھ کو دمِ واپسیں کا خیال نہ ہو"[1]

قدر بلگرامی کو ۲۳ فروری ۱۸۵۹ء کو تحریر فرماتے ہیں[2]:-

"باسٹھ برس کی عمر ہوئی۔ پچاس برس اس شیوے کی ورزش

میں گزرے اب جسم و جان میں تاب و تواں نہیں"

۱۸۵۷ء کے مصائب جھیلنے کے بعد میرزا صاحب کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ ۱۱ اپریل ۱۸۵۹ء کو لکھتے ہیں[3]

"بناوٹ نہ سمجھنا، شعر مجھ سے بالکل چھوٹ گیا۔ اپنا اگلا کلام دیکھ

کر حیران رہ جاتا ہوں کہ یہ میں نے کیونکر کہا تھا"

انھیں کو پھر لکھتے ہیں[4]

"میرا حال اس فن میں اب یہ ہے کہ ہر شعر کہنے کی روش اور اگلے

کہے ہوئے اشعار سب بھول گئے۔ مگر ہاں، اپنے ہندی کلام میں سے

ڈیڑھ شعر، یعنی ایک مقطع اور ایک مصرع یاد رہ گیا ہے۔ سو گاہ گاہ جب

دل الٹنے لگتا ہے، تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آجاتا ہے۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

۱؎ خطوط: ۱، ۱۷۷، ۲؎ ایضاً: ۳۳ ۳؎ ایضاً: ۴۰ ۴؎ اردوئے معلیٰ: ۱۳۷، خطوط: ۳۵۶

پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں، تو یہ مصرع پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں

اے مرگِ ناگہاں! تجھے کیا انتظار ہے؟"

جنون بریلوی نے فارسی اشعار کی فرمائش کی تھی۔ اس کے جواب میں ۸ ستمبر ۱۸۵۹ء کو لکھتے ہیں[1]۔

"فارسی کیا لکھوں، میاں ترکی تمام ہے۔ اخوان و احباب یا مقبول یا مفقود الخبر۔ ہزاروں کا ماتمدار ہوں، آپ غمزدہ اور آپ غمگسار ہوں۔ اس سے قطع نظر کہ تباہ اور خراب ہوں، مرنا سر پر کھڑا ہے، پا برکاب ہوں۔"

اسی سال تفتہ کو ذرا صفائی کے ساتھ لکھا ہے۔[2]

"بات یہ ہے کہ تم مشقِ سخن کر رہے ہو، اور میں مشقِ فنا میں مستغرق ہوں۔ بو علی سینا کے علم کو اور نظیری کے شعر کو ضایع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے، اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے، ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں۔ مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور رہیں گے ان کو شہرت سے کیا حاصل ہوا، کہ ہم تم کو ہوگا۔"

۲۳ مئی ۱۸۶۱ء کو مجروح کے خط میں انتہائی دردناک الفاظ میں فرماتے ہیں[3]۔

"نظام الدین ممنون کہاں؟ ذوق کہاں؟ مومن کہاں؟ ایک آزردہ سو خاموش، دوسرا غالب، سو بیخود و مدہوش۔ نہ سخنوری رہی نہ سخندانی کس برتے پر تتا پانی۔ ہائے دلی! وائے دلی! بھاڑ میں جائے دلی!"

---

[1] خطوط ۱۷۱:۱ [2] خطوط ۱:۱۰۶ [3] اردوئے معلیٰ ۱۴۴:۱؛ عودِ ہندی ۳۶۔

۲۰ جولائی ۱۸۶۲ء کے بعد کسی تاریخ کو علائی کو لکھتے ہیں [۱]

"بھائی، تمھارا باپ بدگمان ہے۔ یعنی، مجھ کو زندہ سمجھتا ہے۔ میرا سلام کہو اور یہ شعر پڑھ کر سناؤ:۔

گمان زیست بود بر منت ز بدیدروی بداست مرگ، ولی بدتر از گمان تو نیست

مجھے کا فور وکفن کی فکر ہے، وہ تکرار شعر وسخن کا طالب ہے۔ زندہ ہوتا، تو وہیں کیوں نہ چلا آتا۔ مجھ پر سے یہ تکلیف اٹھوا لو، اور تم اس زمین میں چند شعر لکھ کر بھیج دو۔ میں اصلاح دے کر بھیج دوں گا۔ عصائے پیر بجائے پیر۔"

اگلے سال تک ترک شعر گوئی نے تنفر کی شکل اختیار کرلی، اور ۱۹ جون ۱۸۶۳ء کو میرزا صاحب نے جنون بریلوی کو صاف لکھ دیا کہ [۲]

"کتاب سے نفرت، شعر سے نفرت، جسم سے نفرت، روح سے نفرت۔"

اور جب تفتہ نے کسی غزل کی اصلاح کے سلسلہ میں لکھا کہ آپ مجھے ایک مطلع لکھ دیجیے، تو انھیں طنزیہ لکھا: [۳]

"سبحان اللہ! تم جانتے ہو کہ میں اب دو مصرعے موزوں کرنے پر قادر ہوں، جو مجھ سے مطلع مانگتے ہو؟"

۱۸۶۴ء میں میرزا صاحب کی یہ حالت ہوگئی کہ انھوں نے تفتہ کو لکھا کہ

"شعر کے فن سے گویا کبھی مناسبت نہ تھی۔" [۴]

اور پھر ایک موقع پر ارشاد فرمایا: [۵]

"کس ملعون نے بسبب ذوق شعر اشعار کی اصلاح منظور رکھی؟ اگر میں شعر سے بیزار ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار۔"

---

[۱] خطوط ج ۱، ۸۸۔ [۲] انشائے نور چشم ص ۵۔ [۳] اردوئے معلیٰ ص ۱۶۹، عود ص ۸۰، خطوط ج ۱، ۲۶۸۔ [۴] خطوط ۱، ۱۹۶۔ [۵] ایضاً ص ۹۲

غالب کا آہنگ ولب ولہجہ

(نیاز فتحپوری)

سب سے پہلے مجھے بتا دینا چاہیے کہ آہنگ اور لب ولہجہ سے میری کیا مراد ہے اور دونوں کا ایک دوسرے سے کیا تعلق ہے۔

آہنگ کے لغوی معنی قصد و ارادہ کے بھی ہیں اور کسی ایسی آواز کے بھی جو موقع کے لحاظ سے موزوں و مناسب ہو، اگر وہ موقع کے لحاظ سے نامناسب ہوگی تو اسے ناآہنگ کہیں گے۔

مناظر طبیعی میں بھی آہنگ ہوتا ہے، لیکن اس وقت فنون لطیفہ کی برآہنگ پیش نظر ہے جس میں قصد انسانی کو بھی دخل ہے مثلاً کسی نقش میں رنگ وخطوط کی موزونیت یا ساز کے تاروں کا ایک سُر میں ملا ہونا یا مغنی کی آواز کا مناسب زیر وبم کہ اُن سب کو لفظ خوش آہنگ سے تعبیر کریں گے۔ بالکل یہی حال شاعری کا ہے کہ اگر شاعر کسی شعر میں جذبات کے تقاضا کے لحاظ سے موزوں الفاظ فراہم نہیں کر سکا، یا کسی مناسب بحر کے انتخاب سے ترنم نہ پیدا کر سکا تو ایسا شعر، ناآہنگ "قرار دیا جائے گا۔

لب ولہجہ بالکل دوسری چیز ہے۔ اس کا تعلق صرف زبان سے ہے، لیکن وہ آہنگ کا ضروری جزو بھی ہے اور جب تک لب ولہجہ آہنگ کا ساتھ نہ دے ادب پیدا نہیں ہوتا خواہ نظم ہو یا نثر، لب ولہجہ کو زبان میں اتنی اہمیت حاصل ہے کہ اس کے اختلاف سے لفظ کا مفہوم ہی کچھ سے کچھ ہو جائے گا۔

ہاں اور نہیں آپ ہر وقت بولتے ہیں، لیکن ان کا تلفظ آپ تعجب، استفہام

یا طنز کے لہجہ میں کہیے، تو معنی بالکل بدل جائیں گے۔ اکبر الہ آبادی مرحوم نے اپنے پوتے کو تفنناً ایک شعر یاد کرا دیا تھا۔

رقیب روسیہ کو ہم نے گاڑی ہانکتے دیکھا
وہ جھوٹا ہے جو کہتا ہے نہیں ہانکی، نہیں ہانکی

ایک دن ضمر الہ آبادی نے جو داغ کے شاگرد اور بڑے خوشگوار شاعر تھے صاحبزادہ سے اس شعر کے پڑھنے کی فرمائش کی۔ جب وہ پڑھ چکا تو اکبر مرحوم نے ان سے کہا کہ آپ خود یہ شعر پڑھ کر اُسے سنایئے۔

ضمر کو شعر پڑھنے میں کمال حاصل تھا، انھوں نے آخر مصرع کے دوسرے ٹکڑے "نہیں ہانکی، نہیں ہانکی" کو مختلف لہجوں میں پانچ بار سنایا اور ہر مرتبہ ایک نیا مفہوم پیدا کیا۔

شعر خوانی ایک مستقل فن ہے، آج کل تو گا کر پڑھنے کا رواج عام ہو گیا ہے، یہاں تک کہ ایک انتہائی کریہہ الصوت، اور بد آواز شاعر بھی ترنم ہی سے شعر سنایا جاتا ہے، لیکن کچھ دن پہلے مشاعروں میں غزلیں، اور مراثی سب تحت اللفظ پڑھے جاتے تھے اور محفل میں سماں بندھ جاتا تھا۔ جن حضرات نے انیس و خاندان انیس کو مرثیہ پڑھتے سنا ہے، اُن سے پوچھیے کہ وہ صرف لب ولہجہ سے کتنی زبردست ساحری کر جاتے تھے۔ لیکن لب ولہجہ کا تعلق محض جنبش اعضا و حرکت جسم و ابرو یا آواز کے نشیب و فراز سے نہیں، بلکہ الفاظ سے بھی ہے جب تک کوئی موزوں ماڈل سامنے نہ ہو، موزوں تصویر کشی ممکن نہیں، اور یہ موزوں ماڈل وہی الفاظ، وہی محاورات ہیں جو بلا تکلف ایک صاحب زبان کے منہ سے بے اختیارانہ نکلتے رہتے ہیں اور بنیاد ہیں سہل ممتنع شاعری کی بھی۔

اب آئیے انھیں دو باتوں کو سامنے رکھ کر غور کریں کہ غالب کی شاعری کا کوئی خاص آہنگ اور لب ولہجہ ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کیا۔

یادگار غالب میں مولانا حالی نے غالب کے لب ولہجہ کے ذکر میں صرف ایک شعر پیش کیا ہے :-

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

انھوں نے لکھا ہے کہ لفظ مکرر سے یہ مقصود ہے کہ پہلے مصرعہ کو ایک بار سوالیہ انداز میں پڑھئے اور پھر دوبارہ حسرت و تاسف کے لہجہ میں۔ بات بڑی معقول ہے، لیکن متبادر نہیں اور اس کا تعلق شعر خوانی سے ہے الفاظ اور زبان سے نہیں۔

غالب کا اردو کلام بیان و معنی دونوں کا بڑا دلچسپ آمیزہ ہے، اگر اس کے بیان تصوف و بیدلانہ دقت پسندی کو چھوڑ دیجئے تو بھی اس کی انفرادیت کو ابھارنے والی بہت سی خصوصیات اس کے کلام میں مل جاتی ہیں۔

اس وقت ہمارا مقصود اس کی تمام شاعرانہ خصوصیات پر گفتگو کرنا نہیں بلکہ صرف اس کے آہنگ ولب ولہجہ کو دیکھنا ہے۔

غالب کی شاعری دراصل معنی آفرینی اور ندرت تعبیر و خیال کی شاعری تھی لیکن وہ زندہ ہے دراصل اپنی زبان کی شاعری سے جس کی مثالیں اس کے اردو کلام میں بھی کافی مل سکتی ہیں۔

غالب کی ان غزلوں کو چھوڑ کر جو یکسر تصنع و تکلف ہیں، دوسری غزلوں پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان میں کوئی نہ کوئی ایک مصرع ضرور ایسا پایا جاتا ہے جس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ غالباً وہی سب سے پہلے اس کے ذہن میں آیا ہوگا اور پھر بعد کو اس نے غزل لکھی ہوگی۔

غالب کبھی اس کو پسند نہ کرتا تھا کہ وہ کسی دوسرے شاعر کی زمین کو سامنے رکھ کر غزل کہے، بلکہ خود اس کے ذہن میں جو بحر یا ردیف و قافیہ آجاتا اسی میں وہ فکر کرتا اور اکثر یہی ہوتا کہ اس کی بنیاد کوئی محاورہ ہوتا یا کوئی ایسا لفظ جو لب و لہجہ سے تعلق رکھتا ہے کبھی کبھی کوئی پورا مصرع کسی خاص آہنگ لب و لہجہ کا اس کے ذہن میں آجاتا اور یہی بنیاد ہوتا پوری غزل کا۔ مثلاً اس کی پہلی غزل لیجئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں سب سے پہلے یہ مصرع اس کے ذہن میں آیا ہو گا۔

صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

جو خوش آہنگ بھی ہے اور تاثرانہ لب و لہجہ بھی رکھتا ہے۔

اسی طرح چھٹی غزل میں تیسرے شعر کا یہ مصرع بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

جو تری بزم سے نکلا وہ پریشاں نکلا

پھر اسے فکر غالب کا اعجاز کہئے یا فیض روح القدس کہ اس کا پہلا مصرع ایسا ہاتھ آگیا کہ پورا شعر حسنِ خیال و حسنِ بیان کا بڑا پاکیزہ نقش بن گیا جس میں آہنگ و لہجہ دونوں کا نہایت لطیف امتزاج پایا جاتا ہے۔

بوئے گل نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل

اس میں صرف تین فقرے فارسی ترکیب کے ہیں جن سے کوئی جملہ نہیں بنتا لیکن پورے شعر کو پڑھیے اور غور کیجئے کہ اس میں کتنا لطیف لب و لہجہ اظہار حسرت کا پنہاں ہے۔

ساتویں غزل کا بنیادی مصرع میری رائے میں یہ ہے۔

ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی نہ ہوا

لیکن اس کو بلندی پر پہونچایا پہلے مصرع نے :-

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجئے

اتفاق سے اسی انداز کا ایک اور شعر اس زمین میں ہو گیا۔

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

ان دونوں شعروں میں کوئی معنی آفرینی نہیں، کوئی جدتِ خیال نہیں، لیکن محض آہنگ اور لب ولہجہ کے دلکش امتزاج نے ان میں جادو بھر دیا ہے۔

بائیسویں غزل کا بنیادی مصرع یہ ہے۔

در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

جو غالباً بیدل کی فارسی ترکیب "بیاباں می چکد" کا تصرف ہے لیکن غالب نے اس کا ترجمہ "ٹپکے ہے" کرکے اسے اردو کا محاورہ بنا دیا اور ایک خاص لب ولہجہ اس کو عطا کیا۔

مصرع :- گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانہ کی ——— اتنا ہم آہنگ نہیں ——— اگر وہ ٹپکنے کی رعایت سے گریہ کا ذکر نہ کرتے تو شعر زیادہ بلند ہو جاتا۔

چھبیسویں غزل کا بنیادی مصرع غالباً یہ ہے۔

پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

لیکن جس تصور سے اس میں کام لیا گیا ہے وہ بالکل بے جان رہتا اگر پہلا مصرع :- "دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز" میسر نہ آجاتا، گو قیامت

ذکر کی کوئی وجہ بظاہر نظر نہیں آتی۔

اس زمین کا دوسرا شعر ہے۔

زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی کیوں ترا راہگزر یاد آیا

البتہ آہنگ اور لب ولہجہ کے لحاظ سے غزل کی جان ہے اور ہوسکتا ہے کہ یہ شعر پورا پورا اس کے ذہن میں القا ہوا ہو۔

---

۳۶ ویں غزل کا شعر ہے۔

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

پورا شعر ایک خاص لب ولہجہ ایک خاص تیور رکھتا ہے جس کو پہلے مصرع کے لفظ "اللہ اللہ" اور دوسرے مصرع کے "اس قدر" سے ابھارا گیا ہے۔

---

۴۳ ویں غزل پوری کی پوری لطف زبان وسادگی بیان کی تصویر ہے، لیکن زیادہ تر دوسرے مصرعوں کی حد تک، پہلے مصرعوں کی خیال آرائی نے غزل کو کافی گرانبار کردیا ہے، کتنا پیارا مصرع ہے:۔

ہم اس کے ہیں ہما پوچھنا کیا

لیکن پہلے مصرع:۔ "دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر" نے اس کو اتنا بوجھل کردیا کہ شعر غارت ہوگیا۔

اسی طرح:۔ "تغافلہائے ساقی کا گلہ کیا" کتنا دلنشیں انداز بیان ہے، لیکن پہلا مصرع:۔ "نفس موجِ محیطِ بیخودی ہے" کتنا ناآہنگ ہے۔

اس غزل کا مقطع البتہ اس نقص سے پاک ہے۔

کیا کس نے جگرداری کا دعوےٰ شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا؟

جس کے حسن کی بنیاد صرف بھلا کیا کے لب و لہجہ پر قائم ہے۔

---

۴۲ ویں غزل کا ایک شعر ہے:-

درد دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلا دوں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا

پہلا مصرع نہ ہو تو دوسرا مصرع بیکار ہے۔ اس کو کہتے ہیں شاعری میں الفاظ کی "دست دگر بیانی" کہ آپ کسی لفظ کو نکال کر دوسرا اس کی جگہ لا ہی نہیں سکتے۔ خاص کر "جاؤں" کہ اس پر پورے مضمون کی بنیاد قایم ہے۔

---

۴۴ ویں غزل پوری کی پوری "آہنگ و لب و لہجہ" کا بڑا لطیف امتزاج ہے، خصوصیت کے ساتھ یہ شعر:-

ترے وعدہ پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

لیکن افسوس ہے کہ استوار اور دو چار قافیے والے اشعار آہنگ غزل سے ہٹ گئے ہیں:-

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا
اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

اس کے بعد کی غزلیں ردیف الف کی سب زبان و بیان کے لحاظ سے حد درجہ خوش آہنگ ہیں۔

ہوئی مدت کہ غالبؔ مر گیا پر یاد آتا ہے — وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں — تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اڑیں گے پرزے — دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

لیکن انھیں زمینوں کے بعض اشعار ایسے بھی ہیں جو غزل کے مزاج کے خلاف ہیں۔ مثلاً

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا — ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

زخم گر دب گیا لہو نہ تھما — کام گر رک گیا روانہ ہوا

ہر بن مو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خونناب — حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

۵۔ دیں غزل کا مطلع و مقطع ملاحظہ فرمائیے۔

حسنِ غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد — بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالبؔ — کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

پہلے شعر سے لفظ "بارے" اور دوسرے سے "کس کے گھر جائے گا" نکال دیجیے، دونوں شعر بے جان ہو جائیں گے۔

۶۔ دیں غزل کا بنیادی مصرع ہے۔

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

لیکن اس کا پہلا مصرع:۔

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر

غالبؔ ہی کہہ سکتا تھا لیکن اس بلندی کو ابھارا "گرنی تھی" کے لب ولہجہ نے۔

---

۸۰ ویں غزل غالبؔ کی نہایت معروف و مقبول غزل ہے اور اس کے تمام اشعار بڑے لطیف و پاکیزہ ہیں لیکن اس کی جان وہی ایک شعر ہے جو زبان و محاورہ سے تعلق رکھتا ہے:۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

"خاک ہو جائیں گے" کو ہٹا کر کوئی دوسرا جملہ اس کی جگہ رکھ کر دیکھئے۔ سارا لطف خاک ہو جائے گا۔

---

۱۰۳ ویں غزل کے دو شعر

ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں
ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

پُوری غزل کا ماحصل ہیں، لیکن محض اس لیے کہ اُن کی بنیاد خوبیٔ زبان اور "بات بگڑ جائے" اور "ظلم کر ظلم" کے لب ولہجہ پر قایم ہے

---

۱۰۴ ویں غزل کا ایک شعر ہے۔

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں؟

پُورے مضمون کی بنیاد دوسرے مصرع کا سوالیہ لب ولہجہ پر قائم ہے۔

---

۱۱۱ ویں غزل کا ایک شعر ہے۔

لو، وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

اس شعر میں لو کی جگہ "ال" رکھ کر دیکھئے، تو زمین و آسمان کا فرق ہو جائے گا، کیونکہ لو کے اندر جو لب ولہجہ نہاں ہے، وہ ہاں میں نہیں ہے۔

۱۱۵ ویں غزل کے دو شعر ہیں۔

کوئی کہے کہ شب مہ میں کیا برائی ہے بلا سے دن کو اگر ابر و باد نہیں
تم ان کے وعدہ کا ذکر ان سے کیوں کرو غالبؔ یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں یاد نہیں

پہلے شعر میں کوئی کہے اور بلا سے۔ اسی طرح دوسرے شعر میں یہ کیا۔ بالکل زبان اور لب و لہجہ سے تعلق رکھتے ہیں اور یہی شعر کی جان ہیں۔

---

۱۲۳ ویں غزل کے دو شعر ہیں۔

ابھرا ہوا نقاب میں ہے اُن کے ایک تار مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو
سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف، سب درست لیکن خدا کرے، وہ ترا جلوہ گاہ ہو

مرتا ہوں کے مفہوم میں جو وسعت، سب درست میں جو لطیف طنز، اور خدا کرے میں جو شدت تمنا پائی جاتی ہے اس کا اظہار کسی دوسرے طریقہ سے ممکن ہی نہ تھا۔

اس میں شک نہیں الفاظ کی ساخت صرف حروف سے ہوتی ہے لیکن معنوی حیثیت سے اصل چیز لب و لہجہ ہے جس کے تغیر سے مفہوم بھی بدلتا رہتا ہے۔

غالب کی ایک مشہور غزل کا شعر ہے۔

بیگانگی خلق سے بیدل نہ ہو غالبؔ کوئی نہیں تیرا، تو، مری جان خدا ہے

اس شعر کی جان صرف مری جان ہے، جس میں تسلی و تشفی کی ایک دنیا آباد ہے

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا وہ جو ہم رکھتے تھے اک حسرت تعمیر سو ہے

شعر کی تمام جذباتی و معنوی خوبیوں کی بنیاد صرف لفظ سو ہے، اس کو نکال دیکھئے، شعر کی ساری تعمیر درہم برہم ہو جائے گی۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم میرا اسلام کہیو، اگر نامہ بر ملے

اس موقع پر "میرا اسلام کہیو" ایک اہل زبان ہی لکھ سکتا تھا دوسرا کیا سمجھ سکتا ہے کہ اس کے لب و لہجہ میں یہاں کتنا زبردست طنز پنہاں ہے۔

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

اس شعر میں دیکھنا کی وسعتِ مفہوم صرف سمجھی جا سکتی ہے بیان نہیں کی جا سکتی۔

ایک ہی غزل کے دو شعر ہیں۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی موت آتی ہے پر نہیں آتی

دونوں شعروں میں پر کا مفہوم اور لب و لہجہ ایک دوسرے سے جدا ہے۔

دل ہی تو یاستِ درباں سے ڈر گیا میں اور جاؤں در سے ترے بِن صدا کیے

اس میں سارے مفہوم کا انحصار لفظ اور پر ہے۔ اس کی جگہ ورنہ بھی کہہ سکتے تھے۔ لیکن اور سے کچھ اور بات پیدا ہوتی ہے جس کا تعلق صرف لب و لہجہ سے ہے۔

غالب کو آخر آخر زبان اور اس کے لب و لہجہ سے اتنی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ اس نے بعض غزلوں کی ردیف اور قوافی ہی ایسے رکھے کہ وہ زبان و لب و لہجہ کا لطف پیدا کر سکے، مثلاً۔

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا

جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

دوست غمخواری میں میری سعی فرماویں گے کیا

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا

بن گیا رقیب آخر، تھا جو رازداں اپنا

جور سے باز آئے، پر باز آئیں کیا

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہیں

آبرو کیا خاک اس گل کی جو گلشن میں نہیں

ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں

ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیوں کر ہو

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو

بسا طِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے
عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے
مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
کب وہ سنتا ہے کہانی میری
سادگی پر اس کی مرجانے کی حسرت دل میں ہے
تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
شکوہ کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے
نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہیے

ان زمینوں میں غالب کی تمام غزلیں زبان، روزمرہ، آہنگ اور لب ولہجہ کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

انتخاب کلام فارسی

(نیاز فتحپوری)

اے بخلا و ملا خوئے تو ہنگامہ زا — با ہمہ در گفتگو بے ہمہ با ماجرا

آب نہ بخشی بزور خون سکندر ہدر — جان نہ پذیری بہیچ نقد خضر نا روا

بزم ترا شمع و گل خستگئ بوتراب — ساز ترا زیر و بم واقعۂ کربلا

بہ لعنت شادم اما زیں خجالت چوں بروں آیم — کہ رشکم در جحیم افگند خلد آرامگاہاں را

خموشی ما گشت بد آموز بتاں را — زیں بیش وگرنہ اثرے بود فغاں را

برطاعتیان فرخ و بعشرتیان سہل — نازم شب آدینۂ ماہ رمضاں را

حالِ ما زغیرے پرسی و منت می بریم — آگہی داری کہ آگہ نیستی از حالِ ما

جانِ غالب تاب گفتارے کجا ندارد ہمہ — سخت بیدردی کہ می پرسی ز ما احوالِ ما

تمکین ناز دادہ چندیں دلی بتان و جانے ہم — دماغ نازک من برنتابد تقاضا را

دلِ مایوس راتسکیں بہ بردن نیتواں دادن — چہ امیدست آخر خضر و ادریس و مسیحا را

خطے بر ہستی عالم کشیدیم از مژہ بستن — زخود رفتیم و ہم با خویشتن بردیم دنیا را

نیست نسیانِ ترا تفرقۂ بدر و ہلال — بادہ مہتاب بود در شب آدینۂ ما

جوئے از بادہ و جوئے ز عسل دارد خلد — لب لعل تو ہم ایں ست و ہم آنست مرا

خارہا از اثر گرمی رفتارم سوخت — منتے بر قدم راہرواں ست مرا

رہرو تشنۂ در رفتہ بہ آبم غالب — تو زخنۂ برلب جو ماندہ نشانست مرا

می برد مور گر جان بسلامت ببرد — تا چہ برقست کہ شد نامزد خرمن ما

با بندۂ خود ایں ہمہ سختی نے کنند — خود را بزور بر تو مگر بستہ ایم ما

بر روئے حاسداں در دوزخ کشودہ رشک — از بہر خویش جنت در بستہ ایم ما

از بسکہ خاطر ہوس گل عزیز بود — خوں گشتہ ایم و باغ و بہار خودیم ما

با چو توئی معاملہ بر خویش منت است — از شکوۂ تو شکر گزار خودیم ما

در کار ماست نالہ و ما در ہوائے او — پروانۂ چراغ مزار خودیم ما

بت مشکل پسند از ابتذال شیوہ میرنجد — بگوئیدش کہ از عمرست آخر بیوفائیہا

سخن کوتہ مرا ہم دل بتقویٰ مائلست اما — ز ننگ زاہد افتادم بکافر ماجرائیہا

زا برمناو حیدری زنارم ار گسستی — از جبہہ ام نزدود کس سجدۂ صنم را

من آں نیم کہ دگر می تواں فریفت مرا — فریبمش کہ مگر می تواں فریفت مرا

زرہ دول کہ بافسانہ درمیاں آید — بہ نیم جنبش سر می تواں فریفت مرا

ز باز ماندن نامہ بر خوشم ہنوز — بہ آرزوئے خبر می تواں فریفت مرا

شب فراق ندارد سحر ولے یک چند — بہ گفتگوئے سحر می تواں فریفت مرا

سرشتہ من بود ایں ورنہ آں نیم غالب — کہ از فنا بہ اثر می تواں فریفت مرا

زمن گرت نبود باور انتظار بیا — بہانہ جوی مباش و ستیزہ کار بیا

زما گسستی و با دیگراں گرو بستے — بیا کہ عہد وفا نیست استوار بیا

وداع و وصل جداگانہ لذتی دارد — ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

فریب خوردۂ نازم چہا نمی خواہم — یکے بہ پرسش جان امیدوار بیا

ز خوئے تست نہاد شکیب نازک تر — بیا کہ دست و دلم میرود ز کار بیا

حصار عافیتی گر ہوس کنی غالب — چو ما بہ حلقۂ رندان خاکسار بیا

چوں بہ قاصد بسپرم پیغام را — رشک نگزارد کہ گویم نام را

بیگناہم پیر دیر از من مرنج — من بمستی بستہ ام احرام را

ترسم کہ دہد نالہ جگر را بدریدن — قطع نظر از جیب بدوزید لبم را

خوشا جانے کہ اندوہے فروگیرد سراپایش — ز نومیدی تواں پرسید لطف انتظار ما

طول سفر شوق چہ پرسی کہ دریں راہ — چوں گرد فرو ریخت صدا از جرس ما

خرسندی غالب نبود زیں ہمہ گفتن — یکبار بفرمائے کہ اے ہیچکس ما

ندانم تا چہ برق فتنہ خواہد ریخت بر ہوشم — تصور کردہ ام بگسستن بند نقابش را

ندانم تا چساں از عہدۂ دوشش بروں آیم — ز شادی جاں بہا گفتم متاع کم بہایش را

تو زود مستی و ما راز دار خوئے تو ایم — شراب درکش و پیمانہ کن حوالۂ ما

درازیِ شب ہجراں ز حد گزشت بیا — فدائے روئے تو عمر ہزار سالۂ ما

چو غنچہ جوشش صفائی تنش ز بالیدن — دریدہ بر تن نازک قبائے تنگش را

سوزد ز بسکہ تاب جمالش نقاب را — دانم کہ درمیاں نہ پسندد حجاب را

نازم فروغ بادہ کہ عکس جمال دوست — گوئی فشردہ اند بجام آفتاب را

آتش دہم بیادہ داد ہر دم از تیز — نوشد می و ز جام فروریزد آب را

آسودہ باد خاطر غالب کہ خوئے اوست — آمیختن ببادۂ صافی گلاب را

چمن ساماں تبے دارم کہ دارد وقت گلچیدن — خرامی کز ادائے خویش پر گل کردہ داماں را

بادۂ مشکبوئے ما بید و کنار کشت ما — کوثر و سلسبیل ما طوبئے ما بہشت ما

بادہ اگر بود حرام بذلہ خلاف شرع نیست — دل ننہی بخوب ما طعنہ مزن بزشت ما

شبم تاریک و منزل دور و نقش جادہ ناپیدا — بلا کم جلوۂ برق شراب گاہ گاہی را

گر بمعنی نرسی جلوۂ صورت چہ کم است — خم زلف و شکن طرف کلاہے دریاب

تا جہاں آئینہ حسرت دیدار تو ایم — جلوہ بر خود کن و ما را بنگاہی دریاب

فرصت از کف مدہ و وقت غنیمت پندار — نیست گر صبح بہاری شب ماہے دریاب

شیوہا دارد و من معتقد خوئے ویم — شود قم از رہ بخشش اگر بفزاید چہ عجیب

خوشست افسانۂ درد جدائی مختصر غالب — بہ محشر میتواں گفت آنچہ در دل ماندہ است امشب

سحر دمیدہ و گل در دمیدنست مخسپ
جہان جہان گل نظارہ چیدنست مخسپ

ز خویش حسن طلب بیں و در صبوحی کوش
مے شبانہ ز لعلِ لب در چکیدنست مخسپ

نفس ز نالہ بہ سنبل درودنست مخسپ
ز خون دل ثمرہ در لالہ چیدنست مخسپ

بذکر مرگ شبے زندہ داشتن ذوقیست
گرت فسانۂ غالب شنیدنست مخسپ

جنت نکند چارۂ افسردگیِ دل
تعمیر باندازۂ ویرانیِ ما نیست

زرشک آیدم بروشنیِ دیدہ ہائے خلق
دانستہ ام کہ از اثرِ گردِ راہ کیست

بیخود بوقتِ ذبح تپیدن گناہِ من
دانستہ دشنہ تیز نکردن گناہ کیست

دلم بعہدِ وفائے فریفت نامہ سپار
خوش ست وعدۂ تو گرچہ از زبان تو نیست

شکستہ رنگِ تو از عشق خوش تماشائیست
بہار دہر برنگینیِ خزانِ تو نیست

روان فدائے تو نازم کہ بردۂ ناصح
زہی لطافت ذوقیکہ در بیان تو نیست

گمانِ زیست بود بر منت ز بیدردی
بدست مرگ ولے بدتر از گمان تو نیست

نظم و نثر شورش انگیزے کہ می باید بخواہ
اینکہ میپرسی کہ غالب در سخن یکتاست ہست

سینہ بکشودیم و خلقے دید کاینجا آتش است
بعد ازیں گویند آتش را کہ گویا آتش است

بی تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلاست
قعر دریا سلسبیل و روئے دریا آتش است

پاک خور امروز زنہار از پئے فردا منہ
در شریعت بادہ امروز آب و فردا آتش است

صلائے قتل دہ و جاں فشانیِ ما بیں
برائے کشتنِ عشاق وعدہ بیارست

بشب حکایتِ قتلم ز غیرے شنود
ہنوز فتنہ بذوق فسانہ بیدارست

غمم شنیدن و نحتے بخود فرو رفتن
چہ غمزہ کہ ہنوزش وجود در تارست

در پردۂ تو چند کرشمہ ناز عاشے
دانم ز روزگار و فراقت بہانہ ایست

ہر چہ فلک نخواستست ہیچکس از فلک نخواست
ظرف فقیہ می نجست بادہ اگر کسی نخواست

جاہ ز علم بے خبر علم ز جاہ بے نیاز
ہم محک تو زر ندید ہم زر من محک نخواست

بحث و جدل بجائے ماں میکدہ جوئے کاندراں — کس نفس از جمل زند کس سخن از فدک نخواست

رند ہزار شیوہ را طاعت حق گراں نبود — لیک صنم بسجدہ در ناصیہ مشترک نخواست

دارم دلے ز آبلہ نازک نہاد تر — آہستہ پا بنہ کہ سر خار نازک ست

امشب آتشیں روئے گرم زند خوانیہاست — کز لبش نوا ہر دم در شرر فشانیہاست

در کشاکش ضعفم نگسلد رواں از تن — اینکہ من نمی میرم ہم ز ناتوانیہاست

کشتۂ دل خویشم کز ستمگراں یکسر — دیدہ دلفریبیہا گفت مہربانیہاست

دائم از سر خاکم رخ نہفتہ بگذشتن — ہاں وہاں خدا دشمن اینچہ بدگمانیہاست

با عدو عتابستی و ز منش حجابستے — وہ چہ دلربائیہا ہی چہ جانستانیہاست

با چنیں تہیدستی بہرہ چہ بود از ہستی — کار ما ز سرمستی آتش فشانیہاست

سرگرمی خیال تو از نالہ باز داشت — دل پارہ آتشیست کہ دودش نماندہ است

دل را بوعدۂ ستمے می تواں فریفت — نازم کہ بروفائے تو بودش نماندہ است

بلبل دلت بنالۂ خونیں بہ بند نیست — آسودہ زی کہ یار تو مشکل پسند نیست

عہد وفا ز سوئے تو نا استوار بود — بشکستی و ترا بہ شکستن گزند نیست

بیخود بزیر سایۂ طوبےٰ غنودہ اند — شبگیر رہروان تمنا بلند نیست

خویش را بصورت پریشاں ہرزہ رسوا کردہ اند — جلوہ می نامند و در معنی نقابے بیش نیست

جلوہ کن منت منہ از ذرہ کمتر نیستم — حسن با ایں تابناکی آفتابے بیش نیست

وائے لب گر دل ز تاب تشنگی بگدازدم — میگساراں مست و من مخمور و ساقی غافلست

ہم وعدہ دہم منع ز بخشش چہ حسابست — جاں نیست مکرر نتواں داد شرابست

ہر چہ از گریہ فشاندیم بہ نشمردن ریخت — ہر چہ از نالہ رساندیم بہ نشنودن رفت

شست و شو مشغلۂ شوخیٔ ابر کرم ست — دزدم آں خرقہ کہ با داغ نیالودن رفت

بجرم دیدۂ خونبار کشتۂ مارا — تراز دامن و ما را ز آستیں پیدا است

تلخست تلخ رشک تمنائے خویشتن   شادم که دل ز وصل تو نومید بوده است

یار در عهد شبابم بکنار آمد و رفت   همچو عیدے که در ایام بہار آمد و رفت

گفتم البته ز من شاد بمردن گردی   گفت دشوار که مردن بتو آسان شده است

شنیده که بآتش نسوخت ابراهیم   ببیں که بے شرر و شعله می‌توانم سوخت

مراد مندیِ گل در گماں فگند امروز   که باز بر سرِ شاخِ گل آشیانم سوخت

نوید آمدنت رشک از تمنا دارد   شگفته روئی گلہائے بوستانم سوخت

نگر بیام عتابے رسیده است از دوست   شکسته رنگیِ یارانِ رازدانم سوخت

خبر دهید بقاتل که هجر می‌گشدم   ز ماهتاب چه منت برم کتانم سوخت

باید بغم نخوردنِ عاشق معاف داشت   آنرا که دل ربودن و نشناختن بسیست

تاثیر آه و ناله مسلم ولے مترس   ما را هنوز عربده با خویشتن بسیست

چو صبح من ز سیاهی بشام مانندست   چگوئیم که ز شب چند رفت یا چندست

نگفته ام که به تلخی بساز و پند پذیر   برو که بادهٔ ما تلخ‌تر ازیں پندست

نگاه مهر بدل سرنداده چشمهٔ نوشش   هنوز عیش باندازهٔ شکرخندست

نه بیم آنکه مبادا بمیرم از شادی   نگوید ار چه ببرگ من آرزومندست

نه آں بود که وفا خواهد از جهاں غالب   بدیں که پرسد و گوید محبت خرسندست

پهلو بشگافید و ببینید دلم را   تا چند بگوئیم که چنان ست و چنان نیست

دل برد و حق آنست که دلبر نتوان گفت   بیداد توان دید و ستمگر نتوان گفت

پیوسته دهد باده و ساقی نتوان خواند   هموارہ ترا شد بت و آزر نتوان گفت

آں راز که در سینه نهانست نه وعظ است   بردار توان گفت و به منبر نتوان گفت

کارے عجب افتاد بدیں شیفته ما را   مومن نبود غالب و کافر نتوان گفت

خواست کز ما رنجد و تقریب رنجیدن نداشت   جرم غیر از دوست پرسیدیم و پرسیدن نداشت

بُرد آدم از امانت ہر چہ گردوں بر نتافت ریخت مے بر خاک چوں در جام گنجیدن نداشت

کلیدِ بستگیِ تست غم بجوش اے دل تو گر چنیں نگدازی گرہ کشای تو کیست
بانتظار تو در پاس وقت خویشتنم فریب خوردۂ نیرنگ وعدہ ہای تو کیست

بدیں نیاز کہ با تست ناز میرسدم گدا بسایۂ دیوار پادشا خفتست
ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتست
درازیِ شب و بیداریِ من ایں ہمہ نیست ز بختِ من خبر آرید تا کجا خفتست
ببیں ز دور و مجو قرب شہ کہ منظر را دریچہ باز و بدروازہ اژدہا خفتست

منت از دل نمیتواں برداشت شکر ایزد کہ نالہ بے اثر ست
قفس و دام را گنا ہے نیست ریختن در نہادِ بال و پرست
ریزد آں برگ و ایں گل افشاند ہم خزاں ہم بہار در گزرست

آنکہ بے پردہ بصد داغ نمایانم سوخت دیدہ پوشید و گماں کرد کہ پنہانم سوخت
نہ بر رستہ شرار و نہ بجا ماندہ رماد سوختم لیک ندانم بچہ عنوانم سوخت

مستم ز خونِ دل کہ دو چشم از آں پرست گوئی مخور شراب و نہ بینی بجام چیست
دلخستۂ غمیم و لب و مے دوای ما با خستگاں حدیثِ حلال و حرام چیست
نیکی ز تست از تو نخواہیم مزد کار ور خود بدیم کار تو ایم انتقام چیست

بہ بانگ صور سر از خاک بر نمی دارم ہنوز در نظرم چشم نیمخوابے ہست
بہارِ ہند بود برشگال ہاں غالب دریں خزاں کدہ ہم موسمِ شرابے ہست

دریں روش بچہ امید دل تواں بستن میانۂ من و او شوق حائل افتادست
چہ اندر آئنہ با خویش لابہ ساز شوی ز خود بجوے کہ ما را چہ در دل افتادست

از خاک رہ گزر بہ فرقِ عریاں ریختن گل کسی جوید کہ او را گوشۂ دستار ہست
در خموشی تابشِ روی عرقناکش نگر تا چہا ہنگامۂ سرگرمی گفتار ہست

ہم از احاطۂ تست اینکہ در جہاں ما را　　قدم بہ بتکدہ و سر بر آستانۂ تست

تو اے کہ محو سخن گستران پیشینی　　مباش منکر غالب کہ در زمانۂ تست

اے حسن گر ازاست نہ رنجی سخنے ہست　　ناز انیمہ یعنی چہ کمر ہیچ و دہاں ہیچ

تن پروری خلق فزوں شد ز ریاضت　　جز گرمی افطار ندارد رمضاں ہیچ

اے جمال تو بتاراج نظر ہا گستاخ　　دی خرام تو بپامالی سرہا گستاخ

مردم از درد تو و درد تو دانم از غیر　　کہ رساند بتو ایں گونہ خبرہا گستاخ

اے ایں پنجہ کہ با جیب کشاکش دارد　　بود با دامن پاکت چہ قدرہا گستاخ

بہشت خویش توانی شدن اگر داری　　دلے کہ خوں شود و رنگ مدعا ریزد

فرو نیامدم از بسکہ بخود دم بطلب　　ہزار بار گزارم بر آشیاں افتاد

اے کہ بدیدہ نم زتست دے کہ بسینہ غم زتست　　ناز بہ غم کہ ہم زتست خاطر شاد میدہد

مست عطائے خود کند ساقی ما نہ مست مے　　دادہ زیاد می برد بسکہ زیاد میدہد

نشاط انگیزی انداز سعی چاک را نازم　　بہ پیراہن نمی گنجد گریبانے کہ داماں شد

خدارا اے بتاں گردش گردیدنی دارد　　دریغا آبروے دیر گر غالب مسلماں شد

زیستم جستجو وز بے ننگ نہ کشتم خود را　　جاں فدائے تو میانہ کز تو حیاے آید

گلت را نوا زگت را تماشا　　تو داری بہارے کہ عالم ندارد

گر دہم شرح عتابے کہ بدلہا داری　　دود از کار گہ شیشہ گراں برخیزد

گر دہم شرح ستمہائے عزیزاں غالب　　رسم امید ہمانا ز جہاں برخیزد

گوہر چہ شکایت کند از بے پر و بالی　　بایم در شکے کہ چکیدن نشناسد

مقصود ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست　　ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

در دام بہر دانہ نیفتم مگر قفس　　چنداں کنی بلند کہ تا آشیاں رسد

از نالہ ام مرنج کہ آخر شد است کار　　شمع خموشم و ز سرم دود میرود

نازم بامتیاز کہ بگذشتن از گناہ　　با دیگراں ز عفو و بما از غرور بود

بخوں تپیدۂ ذوقِ نگاہ نتواں زیست　　شہید آں مژہ ہائے دراز باید بود

ز جوشِ دل ہنوزش ریشہ در آبست پنداری　　بمژگاں قطرۂ خوں غنچۂ ناچیدہ را ماند

آلودۂ ریا نتواں بود عاشقا　　بگذشت خرقۂ کہ بمے شست و شو کنند

پیداست بے نیازیٔ عشق از فنائے ما　　گر زورقے شکست ز دریا چہ میرود

یک رہ اگر بوادیٔ مجنوں کند گزار　　از ساربان ناقۂ لیلیٰ چہ میرود

ہفت آسماں بگردش و ما در میانہ ایم　　غالب دگر مپرس کہ بر ما چہ میرود

چہ عیش از وعدہ چوں باور ز عنوانش نمی آید　　بنوعے گفت می آیم کہ میدانم نمی آید

دوشم کہ گردشِ بختم گلہ بر روئے تو بود　　چشمم سوی فلک و روئے سخن سوئے تو بود

مردن و جاں بتمنائے شہادت دادن　　ہم ز اندیشۂ آزردنِ بازوئے تو بود

در بغل دشنہ نہاں ساختہ غالب امروز　　بگذارید کہ ماتم زدہ تنہا ماند

یک گریہ بیش از ضبط دو صد گریہ رضا دہ　　تا تلخیٔ آں زہر توانم ز گلو برد

دشوار بود مردن و دشوار تر از مرگ　　آنست کہ من میرم و دشوار ندانند

پیمانہ بر آں رند حرامست کہ غالب　　در بیخودی اندازۂ گفتار نداند

دہد بہ مجلسیاں بادۂ بنوبتِ من　　بمن نشاید و در انجمن شرر ریزد

اگر بدل نہ خلد ہرچہ از نظر گزرد　　زہے روانیٔ عمری کہ در سفر گزرد

می بزاہد مکن عرض کہ ایں جوہرِ ناب　　پیش ایں قوم بشورابۂ زمزم نرسد

خواجہ فردوس بمیراث تمنا دارد　　وائے گر در روشِ نسل بآدم نرسد

گفتم گرہ ز کارِ دل و دیدہ باز کن　　از جبہہ ناگشودہ بہ بند نقاب زد

جز سخن کفرے و ایمانے کجاست　　خود سخن در کفر و ایماں میرود

آید و از ذوق نشناسم کہ کیست　　تا رود پنداشتم جاں میرود

نومیدی ما گردش ایام ندارد　　روزے کہ سیہ شد سحر و شام ندارد
بلبل بچمن بنگر و پروانہ بمحفل　　شوقست کہ در وصل ہم آرام ندارد
بوسے کہ ربایند بہ مستی ز لب یار　　نغزست و لے لذت دشنام ندارد

برند دل باداۓ کہ کس گمان نبرد　　فغاں ز پردہ نشیناں کہ پردہ دار انند

دلستاناں نخلند ار چہ جفا نیز کنند　　از وفاۓ کہ بگردند حیا نیز کنند
اندراں روز کہ پرسش رود از ہر چہ گذشت　　کاش با ما سخن از حسرت ما نیز کنند
حلق غالب بنگر و دشنہ سعدی کہ سرود　　خوبرویان جفا پیشہ وفا نیز کنند

گفتند حور و کوثر و دادند ذوق کار　　سنعت نام شاہد و مے آشکار برد
نازم فریب صلح کہ غالب ز کوۓ تو　　ناکام رفت و خاطر امیدوار برد

دریغا کہ کام دلب از کار ماند　　سخنہاۓ ناگفتہ بسیار ماند

نومیدی از تو کفر و تو راضی نہ بکفر　　نومیدیم دگر بتو امیدوار کرد

با من میاویز ای پدر فرزند آزر را نگر　　ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

شایستہ ہمیں ما و تو بودیم کہ تقدیر　　ما را سخن نغز و ترا روی نکو داد
ساقی و گرم برد بہ میخانہ ز مسجد　　مے یک ز قدح بود و فریبم بہ سبو داد
تو نانی از خلاء خار دنگری کہ سپہر　　سر حسین علی بر سناں بگرداند

مے از مے بما بفرست دانگہ بر قدر خواہی　　رواں کن جوی از شیر و دل از بہر بیگاناں بر
مرا گوئی کہ تقوی ورز قربانت شوم خود را　　بیارای تجلی خانہ و تقوی بشاعراں بر

خارہا در رہ سعد از دگان خواہد ریخت　　ورنہ در کوہ و بیاباں بچہ کارست بہار

بیا و جوشش تمناۓ دیدنم بنگر　　چو اشک از سر مژگاں چکیدنم بنگر
زمن بجرم تپیدن کنارہ می کردی　　بیا بخاک من و آرمیدنم بنگر
شنیدہ ام کہ نہ بینی و ناامیدم　　ندیدن تو شنیدم شنیدنم بنگر

دمید دانہ و بالید و آشیاں گہ شد — در انتظار ہما دام چیدنم بنگر
اگر ہوائے تماشای گلستاں داری — بیا و عالم درخوں تپیدنم بنگر
بہار من شد و گل گل شگفتنم دریاب — بخلوتم برو و ساغر کشیدنم بنگر

بجو شمار وفاہائے من ز مردم پرس — بمن حساب جفاہائے خویشتن یاد آر
اے دل از گلبن امید نشانے بمن آر — نیست گر تازہ گلے برگ خزانے بمن آر

برقے کہ جا بجا سوختے دل ز جفاے تو ببیں — شوخی کہ خونہا ریختے دست از حنا باکش نگر
آں سینہ کز چشم جہاں مانند جاں بودی نہاں — اینک بہ پیراہن عیاں از روزن چاکش نگر
خواند بامید اثر اشعار غالب بر سحر — از نکتہ چینی درگزر فرہنگ و ادراکش نگر

گر برق گہ نظارہ گداز است نہادش — بگزار و بہ پیمانۂ ذوق نظرم ریز
سنگیں خبر از لذت آزار ندارد — خارم کن و در رہ گزر جادہ گرم ریز

اے سنگ بر تو دعوئ طاقت مسلم ست — خود را ندیدۂ کف شیشہ گرم ہنوز

با ہمہ گم گشتگی خالی بود جایم ہنوز — گاہ گاہے در خیال خویش می آیم ہنوز
تا سر خار کدامیں دشت در جاں میخلد — کز ہجوم شوق می خارد کف پایم ہنوز

بے پردہ تاب محرمی راز ما مجوی — خوں گشتن دل از مژہ داستیں شناس

ز رنگ و بوئے گل و غنچہ در نظر دارم — غبار قافلۂ عمر و نالۂ جرسش
مرا بہ غیر ز یک جنس در شمار آورد — فغاں کہ نیست ز پروانہ فرق تا مگسش
خوشم کہ دوست خود آشنا یہ بیوفا باشد — کہ در گماں نگاہم امید گاہ کسش
بہار ریشہ جوانے ز نالیش نا شد — کنوں ببیں کہ چہ خوں میچکد ز ہر نفسش

دود سودائے تتق بست آسماں نامیدمش — دیدہ بر خواب پریشاں زد جہاں نامیدمش
وہم خاکے ریخت در چشم بیاباں دیدمش — قطرۂ بگداخت بحر بیکراں نامیدمش
باد دامن زد بر آتش نو بہاراں خواندمش — داغ گشت آں شعلہ از مستی خزاں نامیدمش

قطرۂ خونے گرہ گردید دل دانستمش | موج زہر آبے بطوفاں زد زباں نامیدمش

غربتم ناسازگار آمد وطن فہمیدمش | کرد تنگی حلقۂ دام آشیاں نامیدمش

بود در پہلو بہ تمکینی کہ دل می گفتمش | رفت از شوخی بہ آئینے کہ جاں نامیدمش

تا ز من بگسست عمرے خوشدلش پنداشتم | چوں بمن پیوست بختی بدگماں نامیدمش

او بہ شکر کشتنم مست و بودہ آہ از من کہ من | لاابالی خواندمش نامہرباں نامیدمش

در سلوک از ہرچہ پیش آمد گذشتن داشتم | کعبہ دیدم نقش پائے رہرواں نامیدمش

زلکنت می تپد نبض رگ لعل گہر بارش | شہید انتظار جلوۂ خویشست گفتارش

نہ از مہرست کز غالب بمردن نیستی راضی | سرت گردم تو میدانی کہ مردن نیست دشوارش

تا دلے بنیاد دادہ ام در کشاکش افتادہ ام | اندوہ فرصت یکطرف ذوق تماشا یکطرف

اے آئنہ پیش نظرت از خود جلوہ گر | رحمے بجان خویش کن غمخواری ما یکطرف

بزم بادہ گریباں کشودنش نگرید | خوشا بہانۂ مستی خوشا رعایت شوق

شکوہ و شکر ہرزہ و باطل | غالب و دوست آبگینہ و سنگ

تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر | بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

راہے ز کنج دیر بہ مینو کشودہ ام | از خم کشم پیالہ و در کوثر افگنم

شعلہ چکید غم کہ اگر تنگدل مزد کو | شمع شبستانیم باد سحرگاہیم

دور فتادم ز یار ماہی بے دجلہ ام | نیست دلم در کنار دجلۂ بے ماہیم

بادہ بوام خوردہ و زر بقمار باختہ | وہ کہ ز ہرچہ ناسزاست ہم بسزا نہ کردہ ایم

تا بچہ مایہ سر کنیم نالہ بعذر بے غمی | از نفس آنچہ داشتیم صرف ترانہ کردہ ایم

خار ز جادہ باز چیں سنگ بگوشہ در فگن | در سر رہ گرفتنش ترک بہانہ کردہ ایم

گر فراموشی بفریادم رسد وقتست وقت | رفتہ ام از خویشتن چندانکہ دریاد خودم

صید ہم دل را ز بیداد فریب التفات | سادگی بنگر کہ در دام تو صیاد خودم

خوں شد اجزای زمانی در رفتار بیخودی / رفت ایامے کہ من امسال و پاری داشتم

دیگر از خویشم خبر نبود تکلف برطرف / اینقدر دانم کہ غالب نام یاری داشتم

زاہد خو شست صحبت آلودگی مترس / کاین خرقہ بارہا بہ مے ناب شستہ ایم

اے در عتاب رفتہ ز بیرنگی سرشک / غافل کہ امشب از مژہ خونناب شستہ ایم

با تو عرض وعدہ ات حاشا کہ از ابرام نیست / ہر چہ میگوئی ہمی خواہم کہ تکرارش کنم

راحت نخود جستم و رنج فراواں یافتم / مژدہ دشمن را اگر جہدے در آزارش کنم

در غمش عمرے بسر بردم ندعوی شرم نیست / فرصتے کو کز وفائے خود خبردارش کنم

آئندہ و گزشتہ تمنا و حسرت است / یک کاشکی بود کہ بصد جا نوشتہ ایم

دیدیم کہ مے ستی اسرار ندارد / رفتیم و بہ پیمانہ فشردیم جگر ہم

تا بند نقاب کہ کشود دست کہ غالب / رخسارہ بناخن صلہ دادیم و جگر ہم

رنگہا چوں شد فراہم مصرفے دیگر نداشت / خلد را نقش و نگار طاق نسیاں کردہ ایم

زاہد از ما خوشۂ تاکی بچشم کم مبیں / نیدانی کہ یک پیمانہ نقصاں کردہ ایم

کشتی بے ناخدایم سرگزشت من مپرس / از شکست خویش بر دریا کنارا دادہ ام

عرصۂ شوق ترا مشتِ غباریم ما / تن چو ریزد ز ہم ہم بہ تپیدن دہیم

دل ز جوش گریہ بر خویشتن بالدروالت / قطرہ بود دست و گہر بیکرانش کردہ ام

میربایم بوسہ و عرض ندامت میکنم / اختراعے چند در آداب صحبت میکنم

سنگ و خشت از مسجد ویرانہ می آرم بہ شہر / خانۂ در کوئے ترساں عمارت میکنم

کردہ ام ایمان خود را دستمزد خویشتن / می تراشم پیکر از سنگ و عبادت میکنم

چشم بد دور التفاتے در خیال آوردہ ام / ہر چہ دشمن میکند با دوست نسبت میکنم

گاہ گاہ از نظم مستی و غزلخواں بگزرد / ورنہ بر عہدۂ من نیست کہ رسوا باشم

گرفتہ خاطر اند احباب و سرخوشی باقیست / ترانۂ کہ نہ گنجد بساز میخواہم

برون میا کہ ہم از منظر کنارۂ بام
نظارۂ ز در نیمباز میخواہم

ز من حذر نہ کنی گر لباس دین دارم
نہفتہ کافرم و بت در آستین دارم

بیا کہ قاعدۂ آسمان بگردانیم
قضا بہ گردش رطل گران بگردانیم

ز چشم و دل بتماشا تمتع اندوزیم
ز جان و تن بمدارا زیان بگردانیم

بگوشۂ بنشینیم و در فراز کنیم
بہ کوچہ بر سر رہ پاسبان بگردانیم

اگر ز شحنہ بود گیر و دار نندیشیم
وگر ز شاہ رسد ارمغان بگردانیم

اگر کلیم شود ہمزبان سخن نہ کنیم
وگر خلیل شود میہمان بگردانیم

گل افگنیم و گلابے برہ گزر پاشیم
می آوریم و قدح درمیان بگردانیم

بمن وصال تو باور نمی کند غالب
بیا کہ قاعدۂ آسمان بگردانیم

دلا خون گشتی و گفتی کہ ہی گردید کار آخر
مشو افسردہ غافل عالمی دارد چکیدن ہم

چہ خیزد گر نقابی از میان برخاست کو تمکین
کہ می بینم نقاب عارض یارست دیدن ہم

دل از تمکین گرفت و تاب وحشت نبودم غالب
نگنجد در گریبان من از تنگی دریدن ہم

زخم جگرم بخیہ و مرہم نہ پسندم
موج گہرم جنبش و رفتار ندانم

نقد خردم سکہ و سلطان نہ پذیرم
جنس ہنرم گرمی بازار ندانم

زانچہ دل زہم پاشد لب چہ طرف بربندد
یا مجال گفتن دہ یا نہ گفتہ باور کن

جنون مستم بہ فصل نوبہارم میتوان کشتن
صراحی بر کف و گل در کنارم میتوان کشتن

بجرم اینکہ در مستی بپایان بردہ ام عمری
بکوئے میفروشان در خمارم میتوان کشتن

بہجران زیستن کفرست خونم را دیت نبود
چراغ صبحگاہم آشکارم میتوان کشتن

تغافلہائے یارم زندہ دارد ورنہ در بزمش
بجرم گریۂ بے اختیارم میتوان کشتن

جفا بر جوی منے کم کن کہ گر کشتن ہوس باشد
بذوق مژدۂ بوس و کنارم میتوان کشتن

منت معتقد دارم ولیکن اے نامہربان آخر
بدین جان و دل امیدوارم میتوان کشتن

بخونِ من اگرش ننگ است دست و خنجر آلودن — نوید وعدهٔ کز انتظارم میتوان کشتن

گرفتم یار باشد بے نیاز از کشتنم غالب — بدرد بے نیازیہائے یارم میتوان کشتن

در خلد ز شادی چہ رود در بر سوم آیا — چون کم نشود بادہ ز بسیار کشیدن

لب بر لب دلبر نہم و جاں بسپارم — ترکیب یکے کردن صد ملتمس است این

خوش بود فارغ ز بند کفر و ایماں زیستن — حیف کافر مردن و آوخ مسلماں زیستن

شیوهٔ رندان بے پروا خرام از من بپرس — اینقدر دانم کہ دشوار است آساں زیستن

بر نوید مقدمت صد بار جاں باید فشاند — بر امید وعده ات زنہار نتواں زیستن

اگر بقدر وفا میکنی جفا حیف است — بمرگ من کہ ازیں بیش میتواں کردن

مائیم و ذوق سجده چہ مسجد چہ بتکده — در عشق نیست کفر ز ایماں شناختن

لخت دلم بدامن و چاک غمم بجیب — اینک سزائے جیب ز داماں شناختن

آزادیم نخواہی و ترسم کزیں نشاط — بالم بخود چنانکہ نگنجم بہ بند تو

دولت بہ غلط نبود از سعی پشیماں شو — کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو

دارم دلے ز غصہ گرانبار بودهٔ — بر خویشتن ز آبلہ چیزے فزودهٔ

با دوستاں مباحثہ دارم ز سادگی — در باب آشنائی نا آزمودهٔ

چوں زبانہا لال و جانہا پر ز غوغا کردهٔ — بایدت از خویش پرسید آنچہ با ما کردهٔ

گر نہ مشتاق عرض دستگاه حسن خویش — جاں فدایت دیده را پس چہ بینا کردهٔ

صد گناه آنرا کہ ہم امروز رخ بنمودهٔ — مژده باد آنرا کہ محو ذوق فردا کردهٔ

جلوه و نظاره پنداری کہ از یک گوہر است — خویش را در پرده خلقے تماشا کردهٔ

بلبلِ بگوشۂ قفس از خستگے منال — چوں من بہ بند خار و خس آشیاں نۂ

گوئی یکیست پیش تو بود و نبود من — با من نشستهٔ و ز من سرگراں نۂ

یا بہ بساط دلبری عام کن ادائے لطف — یا ز نگاه خشمگیں مژدهٔ امتیاز ده

گر بہ غمے کہ خوردہ ام رخصت شکوہ آہ نیست — ہم بدلے کہ بردۂ طاقت ضبط نالہ دہ

حسن در جلوہ گری بانگ شد منت غیر — ہر گل از خویشتن آتش داماں زدۂ

وائے بر من کہ رقیب از تو بہ من بنماید — نامۂ واشدۂ مہر بعنواں زدۂ

بر در دوست دپائے بند گرانے نہادۂ — نازم بہ بندگی کہ نشانے نہادۂ

بگوشم می رسد از دور آواز درا امشب — دلی گم گشتہ دارم کہ در صحرا است پنداری

غم چہ درد بود از ما اینک انچہ بود از ما — سینہ وا اندہی خاطرے وا آزاری

ناز و مومن دکافر بر چہ دستگاہ آخر — سبحہ و سواکے تشقہ و زناری

شوخی شمیمش بیں جنبش نسیمش بیں — غنچہ راست آہنگی سرو راست رفتاری

دو برق فتنہ نہفتند در کف خاکے — بلائے چیر یکے رنج اختیار یکے

مرو ز آئنہ خانہ کہ خوش تماشائیست — یکے تو محو خودی وجو تو ہزار یکے

زہے نگاہ بکیں و شرم در اندیشہ — یکے بدر زدی دل رفت و پردہ دار یکے

رود تن بخرابی دہ تا کار رواں گردد — طوفاں زدہ زورق را ہر موج عنانستے

تا دم زدل بردکا فرادائے — بالا بلندے کوتہ قبائے

چوں مرگ ناگہ بسیار شتابے — چوں جاں نہ اثرہا اندک وفائے

گستاخ سازے پوزش پسندے — طاقت گدازے صبر آزمائے

از زلف پر خم مشکیں نقابے — از تابش تن زریں ردائے

اے موج گل نوید تماشائے کیستی — انگارہ مثالی سراپائے کیستی

بیہودہ نیست سعی صبا در دیار ما — اے بوئے گل پیام تمنائے کیستی

خوں گشتم از تو باغ و بہار کہ بودۂ — کشتی مرا بغمزہ مسیحائے کیستی

نشنیدہ لذتِ تو فرو میرود بدل — اے حرف محو لعل شکر خائے کیستی

باہیچ کافرانہ سخن نمی رود — اے شب بلرگ من کہ تو فردائے کیستی

رفت آنکہ کسب بوی تو از باد کردمی ۔ گل دیدمی و روی ترا یاد کردمی

رفت آنکہ گر لبت بنفرین نواختمی ۔ رنجیدہ می و عربدہ بنیاد کردمی

رفت آنکہ جانب رخ و قدت گرفتمی ۔ در جلوہ بحث با گل و شمشاد کردمی

اکنون خود از وفای تو آزادمی کشم ۔ رفت آنکہ از جفای تو فریاد کردمی

بندم منہ ز طرہ کہ تابم نماندہ است ۔ رفت آنکہ خویش را بہ بلا شاد کردمی

ای تو کہ ہیچ ذرہ را جز بہ رہ تو روی نیست ۔ در طلبت توان گرفت بادیہ را بہ رہبری

ہر کہ دلست در برش داغ تو در دیش ز دل ۔ تا چو بدیگرے دہد باز بری بداوری

حیف کہ من بخوں تپم وز تو سخن رود کہ تو ۔ اشک بدیدہ بشکری نالہ بسینہ بنگری

بیم از گداز دل در جگر آتشے چو سیل ۔ غالب اگر دم سخن رہ بہ ضمیر من بری

انتخاب کلام اردو

(نیاز فتحپوری)

کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، درد بے دوا پایا

سادگی و پرکاری، بیخودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

حالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈا تم نے بارہا پایا

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے، تم نے کیا مزا پایا

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجومِ اشک سے تارِ نگہ نایاب تھا

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبجو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

نہ دے نامہ کو اتنا طول غالب مختصر لکھ دے
کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستمہائے جدائی کا

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو
ہمیں دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے　　ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضہ کا

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے　　صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

حریف جوشش دریا نہیں خودداری ساحل　　جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے　　شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو　　آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ　　ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب　　جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

اعتبار شوق کی خانہ خرابی دیکھنا　　غیر نے کی آہ، لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل　　دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز　　پھر ترا وقت سفر یاد آیا

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی　　کیوں ترا راہگزر یاد آیا

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم　　میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک　　میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا　　جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز　　میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

کاوش کا دل کرے ہے تقاضہ کہ ہے ہنوز　　ناخن پہ قرض اُس گرہ نیم باز کا

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا　　زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائیں گے کیا

حضرت ناصح گر آئیں، دیدہ و دل فرش راہ　　کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم، اللہ اللہ!　　اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں　　چراغ کشتہ ہوں میں بے زباں گور غریباں کا

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا　　قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا
محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا
دماغِ عطر پیراہن نہیں ہے غم آوارگیہائے صبا کیا
کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا
بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا
درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا

گھر ہمارا، جو نہ روتے بھی، تو ویراں ہوتا بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا
بعد یک عمر ورع، بار تو دیتا بارے کاش رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا

تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ اس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا
بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا ہو گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا
دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے بارے آشنا نکلا، ان کا پاسباں اپنا

ترے وعدہ پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ کہاں بچیں کہ دل ہے غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شبِ غم بری بلا ہے مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
ہوئی مدت کہ غالب مرگیا، پر یاد آتا ہے وہ ہر اک بات پر کہنا کہ "یوں ہوتا تو کیا ہوتا"

گرچہ ہوں دیوانہ، پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا
منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا
در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا
لاگ ہو تو ہم اسے سمجھیں لگاؤ جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا
موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا
پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا
تھی خبر گرم کہ غالب کے اُڑیں گے پُرزے دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد
آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالب کس کے گھر جائے گا سیلابِ فنا میرے بعد

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر
نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اس نے شدت کی ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

ہر چند یک دست ہوئے بت شکنی میں ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز دعا قبول ہو یا رب کہ عمرِ خضر دراز
تو اور آرائشِ خمِ کاکل میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک
غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک
ترے سرو قامت سے یک قدِ آدم قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

تماشا کر، اے محوِ آئینہ داری — تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

وہ فراق اور وہ وصال کہاں — وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے — ذوقِ نظارۂ جمال کہاں

تھی جو اک شخص کے تصور سے — اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں — غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو — تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت — یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے — کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو — یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

ترے جواہرِ طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں — ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر ان سے — کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں — اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں

کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا — پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی — روح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں

کب سے ہوں، کیا بتاؤں جہانِ خراب میں — شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام — ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

میں اور حظِ وصل، خدا ساز بات ہے — جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی — پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں — ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار — اے کاش، جانتا نہ تری رہگزر کو میں

ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے — کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

لو، وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

پھر بیخودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

نیند اُس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اسکی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

یونہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں

تم اُن کے وعدہ کا ذکر ان سے کیوں کرو غالب
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردہ میں منہ چھپائے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

واں وہ غرورِ عز و ناز یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا، کیجئے ہائے ہائے کیوں

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو، تو کہاں جائیں، ہو تو کیونکر ہو

قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا برا کیا ہے نوا سنجانِ گلشن کو

نہیں گر ہمدمی آساں، نہ ہو، یہ رشک کیا کم ہے
نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بتخانہ میں، تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

کسی کو دیکے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منھ میں زباں کیوں ہو

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

کیا غمخوار نے رسوا، لگے آگ اس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر بلبل
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے
مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

نہ اتنا بُرّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی

مئے عشرت کی خواہش، ساقیِ گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

مرے دل میں ہے غالب شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جب اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

ڈھونڈے ہے اس مغنیِ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں
آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

سر پر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

بیگانگیِ خلق سے بیدل نہ ہو غالب
کوئی نہیں تیرا، تو مری جان خدا ہے

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے
آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے

غیر کو یارب وہ کیونکر منعِ گستاخی کرے
گر حیا بھی اسکو آتی ہے تو شرما جائے ہے

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے
دل کی یہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

وہ آ کے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے
ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

پھر اسی بیوفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

بیخودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوش قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

پھر جا رہا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیر بارِ منت درباں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابندِ نے نہیں ہے

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

داغِ فراق صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

سادگی پر اس کی مرجانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

گرچہ ہے کس کس خرابی سے ولے باایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

بس ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائے گی
وہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

میرے غم خانہ کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسباب ویرانی مجھے

وعدہ آنے کا وفا کیجئے یہ کیا انداز ہے
تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

گھر میں کیا تھا کہ ترا غم اسے غارت کرتا — وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذت فراغ — تکلیف پردہ داری زخم جگر گئی
دیکھو تو دلفریبی انداز نقش پا — موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی
فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا — تم کیا گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی
نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا — مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی
مارا زمانہ نے اسد اللہ خاں تمھیں — وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

نوید امن ہے بیداد دوست جاں کے لیے — رہی نہ طرز ستم کوئی آسماں کے لیے
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر — نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے
فلک نہ دور رکھ اس سے کہ میں ہی نہیں — دراز دستی قاتل کے امتحاں کے لیے
مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر — کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے — حوران خلد میں تری صورت مگر ملے
تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم — میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے
لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں — جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہمسفر ملے
اے ساکنان کوچۂ دلدار دیکھنا — تم کو کہیں جو غالب آشفتہ سر ملے

کوئی دن گر زندگانی اور ہے — اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں — پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے
دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر — کچھ تو پیغام زبانی اور ہے
ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام — ایک مرگ ناگہانی اور ہے

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی — موت آتی ہے پر نہیں آتی

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم کو ان سے وفا کی ہے امید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

ہاں اہلِ طلب، کون سنے طعنۂ نایافت — دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے
اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں — اس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے
اس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالب — ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پہ رونق — وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن — دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

دیکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف — آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ "تو کیا ہے" — تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے
رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل — جب آنکھ سے ہی نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے
رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی — تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی — ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ — کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے — اب کسے رہنما کرے کوئی
جب توقع ہی اٹھ گئی غالب — کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے — بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے
غالب تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا — مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے

زہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو — کاش کہ تم مرے لیے ہوتے

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے — کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل — اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

اس نزاکت کا بُرا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا — ہاتھ آجائیں اگر ہاتھ لگائے نہ بنے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے — پردہ ڈالا ہے وہ اُسنے کہ اٹھائے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے — تم کو چاہوں کہ نہ آؤں تو بلائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالبؔ — کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

دیا ہے دل اگر اس کو، بشر ہے کیا کہیے — ہوا رقیب تو ہو، نامہ بر ہے کیا کہیے

یہ ضد کہ آج نہ آوے اور آئے بن نہ رہے — قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے

کہا ہے کس نے کہ غالبؔ بُرا نہیں لیکن — سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیے

نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ "ہم ستمگر ہیں" — مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیے

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جاوے — نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالبؔ — خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے — بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن — بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی — وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

محبت میں بے فرق جینے اور مرنے کا — اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ — پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم — دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا — ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

انتخاب نسخۂ حمیدیہ

تغافل بدگمانی - میری سخت جانی سے نگاہِ بے حجابِ ناز کو بیمِ گزند آیا

خورِ شبنم آشنا نہ ہوا ورنہ میں اسدؔ سرتا قدم گزارشِ ذوقِ سجود تھا

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

ساغرِ جلوۂ سرشار ہے ہر ذرۂ خاک شوقِ دیدار بلا آئینہ ساماں نکلا

کچھ کھٹکتا تھا مرے سینہ میں لیکن آخر جس کو دل کہتے تھے سو تیر کا پیکاں نکلا

شوخیِ رنگِ حنا خونِ وفا سے کب تک آخر اے عہد شکن تو بھی پشیماں نکلا

وسعتِ رحمتِ حق دیکھ کہ بخشا جاوے مجھ سا کافر کہ جو ممنونِ معاصی نہ ہوا

ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار سبزہ بیگانہ صبا آوارہ گل نا آشنا

ہے آہ میری خاطرِ وابستہ کے سوا دنیا میں کوئی عقدۂ مشکل نہیں رہا

عشق میں ہم نے ہی ابرام سے پرہیز کیا ورنہ جو چاہیے اسبابِ تمنا سب تھا

نہ بخشی فرصتِ یک شبنمستاں جلوۂ خور نے تصور نے کیا ساماں ہزار آئینہ بندی کا

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا

مہربانہائے دشمن کی شکایت کیجیے یا بیاں کیجیے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست

تماشائے گلشن، تمنائے چیدن بہار آفرینا گنہگار ہیں ہم

سر پہ مرے وبالِ ہزار آرزو رہا یارب میں کس غریب کا بختِ رمیدہ ہوں

میں چشمِ وا کشادہ و گلشن نظر فریب لیکن عبث کہ شبنمِ خورشید دیدہ ہوں

اسدؔ بزمِ تماشا میں تغافل پردہ داری ہے اگر ڈھانپے تو آنکھیں ڈھانپ ہم تصویرِ عریاں ہیں

اے نوا سازِ تماشا سر بکف جلتا ہوں میں اک طرف جلتا ہے دل اور اک طرف جلتا ہوں میں

بے دماغی حیلہ جوئے ترکِ تنہائی نہیں — ورنہ کیا موجِ نفس زنجیرِ رسوائی نہیں

ستم کشی کا کیا دل نے حوصلہ پیدا — اب اس سے ربط کروں جو بہت ستمگر ہو

مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی — وائے ناکامی کہ اس کافر کا خنجر تیز ہے

جوہر آئینہ ساں مژگاں بدل آسودہ ہے — قطرہ جو آنکھوں سے ٹپکا سو نگاہ آلودہ ہے

داغگاہِ عجز میں سامانِ آسائش کہاں — پرفشانی بھی فریبِ خاطرِ آسودہ ہے

تا چند نازِ مسجد و بت خانہ کھینچیے — جوں شمع دل بہ خلوتِ جانانہ کھینچیے

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر — دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے

(ختم شد)

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں مزید اس طرح کی شاندار، مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884

سدرہ طاہر : 03340120123

حسنین سیالوی : 03056406067